MUNTAKHABAT-E-URDU

(URDU SELECTIONS)

Volume - I
VERSE

According to M.A. Urdu Course
2009 onwards

Compiled by:

SHAHNAZ NABI

Head, Deptt. of Urdu, University of Calcutta

UNIVERSITY OF CALCUTTA
87/1, College Street, Kolkata-700073

CUL-H00475-1-U7148823

MUNTAKHABAT-E-URDU

(URDU SELECTIONS)

264/1

Volume - I

VERSE

According to M.A. Urdu Course

2009 onwards

Compiled by :

SHAHNAZ NABI

Head, Deptt. of Urdu, University of Calcutta

UNIVERSITY OF CALCUTTA

87/1, College Street, Kolkata-700073

Professor Suranjan Das
M.A. (Cal.), D.Phil (Oxon)
Vice-Chancellor
University of Calcutta
&
Member, Indian Council of Historical Research
Government of India.

UNIVERSITY OF CALCUTTA
SENATE HOUSE, 87/1, COLLEGE ST.
KOLKATA-700 073, W.B., INDIA
Phone : 2219-3763
Telefax : 2241-3288
E-mail: suranjandas2000@yahoo.co.in
suranjan323@gmail.com

Date : December 25, 2009

Message

I congratulate the Department of Urdu for revising its syllabus and introducing the semester system for its post graduate students. I also express my sincere thanks and gratitude to the Department for taking the initiative of publishing a compilation of study material to enrich the teaching learning process. This will certainly be of great help for teachers and students alike. I particularly thank Professor Shahnaz Nabi and her colleagues for the exercise that the Department has undertaken. The University will certainly support all academic exercises that the department proposes to undertake in future.

Suranjan Das

(Suranjan Das)

Residence : FE-14, Salt Lake City, Kolkata - 700 106, West Bengal, India, Tele : 2358-2389

Preface

The syllabi of the Two year M.A. Course in Urdu was last revised in the year 1991. Since then Urdu literature has not only increased quantitatively but also evolved in terms of quality. Therefore before the introduction of Semester System of examinations in the M.A. Course it was felt that a revision in the syllabi is a necessary imperative. Such a revision does not mean a complete change and overhauling of the syllabi, hence all the important writers of each age have been included in the revised syllabus. In some cases the pieces that were originally included in the previous syllabi but have not been available till date, have been excluded. A new thrust area involving modernist and postmodern writings has been included and a new group on 'Translation' has been introduced.

With a view to maintaining and upgrading the quality of education the Department of Urdu realized an urgent need to expand the available resources of studying Urdu language and literature. The compilation of the study material in its present form is an attempt to facilitate the students of Urdu. The pieces taken from rare books are now made available as texts through this book.

The undersigned and faculty members of the Department of Urdu are extremely grateful to the Hon'ble Vice-Chancellor of Calcutta University Prof. Suranjan Das without whose keen interest, unstinting support and kind permission this publication could not have become a reality.

I thank the Hon'ble Vice-Chancellor for this act of kindness and co-operation. This is for the first time that the Selections of Urdu Prose & Verse for M.A. students is being published by the University Press.

I thank all my colleagues who helped in preparing the syllabus.

Shahnaz Nabi

Prof. Dr. Shahnaz Nabi
Head, Department of Urdu
University of Calcutta

25th December, 2009

خدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے
مجھے جانے دے، اب رہنے سے میری جان جاتی ہے

مرے محبوب میرے دوست اب جانے بھی دے مجھ کو
بس اب جانے بھی دے اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو!

●●●

خواب کی بستی

ن-م-راشد

مرے محبوب جانے دے مجھے اس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا اور تیر کے مانند جاؤں گا
کہیں اس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا
گوارا کر خدارا اس قدر ایثار جانے دے
نہ کر اب ساتھ جانے کے لئے اصرار جانے دے
میں تنہا جاؤں گا تنہا ہی تکلیفیں اُٹھاؤں گا
مگر اس پار جاؤں گا تو شاید چین پاؤں گا
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار جانے دے
مجھے اس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے؟
مجھے اس پار لینے کے لئے وہ کون آیا ہے

جنوں سا ہوگیا ہے مجھ کو احساسِ بضاعت پر
ہماری بھی نہیں ، افسوس، جو چیزیں "ہماری" ہیں!

کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا!
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا!

●●●

انسان

ن-م-راشد

(۱۹۱۰ء - ۱۹۸۰ء)

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں ، جاہلوں ، مُردوں کی ، بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأتِ تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی!
اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اُٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر

بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں

فضا ہے مست ، موجِ نکہتِ بادِ بہاری سے

اور اس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

●●●

تاثراتِ نغمہ

اختر شیرانی

(۱۹۰۵ء - ۱۹۴۸ء)

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
افق پر موجزن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں ہیں
فضا میں بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا
خلا میں پرفشاں ہیں خواب کی شہزادیاں گویا
بہار و کیف سے لبریز مستانہ ہوائیں ہیں
اور ان میں منتشر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں
مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا
وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نظارے برستے ہیں
شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں
ستاروں کے سمندر، ماہتابوں کے جزیرے ہیں

جو پل جائے لوٹ نہ پائے
دیا جلے بجھ جائے
پھر بھی آنکھیں سپنے دیکھیں
درپن مانگ سجائے
پتا پتا جھڑے بڑھاپا
پھول چنے کم سن
مگر ہر تول برابر رہے

●●●

گیت

ندا فاضلی

(۲)

بھاگ رہی ہیں کالی راتیں
دوڑ رہے ہیں دن
بدلتا پل پل منظر رے
بوڑھے برگد کو گھن چاٹے
ہر لوہا مڑ جائے
پکی اینٹوں کا دو محلا
تنکوں سا اُڑ جائے
تھال کٹورے ، سونا چاندی
چاہے جتنا گھن
سبھی کچھ کنکر پتھر رے

رات کے منہ میں سورج
سورج میں قیدی سب ہاتھ
ننگے پیر عقیدے سارے پگ پگ لاگے کانٹا
جیون.....

●●●

گیت

ندا فاضلی

(پیدائش:۱۹۳۸ء)

(۱)

جیون شور بھرا سناٹا
زنجیروں کی لمبائی تک سارا سیر سپاٹا
جیون.....
ہر مٹھی میں الجھا ریشم
ڈورے بھیتر ڈورا
باہر سو گانٹھوں کے تالے
اندر کاغذ کورا
کاجل ، شیشہ ، پرچم ، تارا
ہر سودے میں گھاٹا
جیون شور بھرا سناٹا
چاروں اُور چٹانیں حائل
بیچ میں کالی رات

جب اس کا گیت ہی ماندا ہوا جب دل بھی ڈھلتا چاند ہوا
اب یونہی جی بہلائیں گے
کب آنے والے آئیں گے

●●●

گیت

میراجی

(۲)

جب آنے والے آئیں گے
تب سب بندھن کھل جائیں گے
اب جھلمل جھلمل تارے ہیں سب پیتم کے ہرکارے ہیں
یہ اپنا جی بہلائیں گے
آنے والے آجائیں گے
اب جگمگ جگمگ چندا ہے سپنوں کا گورکھ دھندا ہے
سپنوں میں ہم کھو جائیں گے
اور آنے والے آئیں گے
دن بیتا شام بھی بیت گئی اور رات بھی بازی جیت گئی
کچھ دیر میں تارے جائیں گے
آنے والے کب آئیں گے

اب گیت میں رس ٹپکاتے ہیں یوں دل کی آگ بجھاتے ہیں
اب سب کے لئے وہی ہاؤلے ہیں
جو بیتے سمے میں سیانے رہے

●●●

گیت

میراجی

(۱۹۱۲ء - ۱۹۴۹ء)

(۱)

ان جانے نگر من مانے تھے
من مانے نگر ان جانے رہے
اپنی باتوں کی مستی میں سنتے رہے دل کی بستی میں
وہی گیت جو کچھ من مانے رہے
وہی راگ جو سکھ کے بہانے رہے
راتیں بنیں دن بیت گئے راتیں بھی نئی پھر دن بھی نئے
مورکھ من ایسا ہٹیلا ہے
اُسے یاد وہ رنگ پرانے رہے
انہونی کا جسے دھیان رہا ہونی نے اُسے چپکے سے کہا
نہ وہ باتیں رہیں نہ زمانے رہے
جو رہے بھی تو باقی فسانے رہے

رُباعیات

آصف بنارسی

(۱۹۰۱ء - ۱۹۷۷ء)

(۱)

امید پہ ہی زیست کا ہے دارومدار
ممکن نہیں اس سے تو کسی کو انکار
معلوم ہے اے منکرِ دین و مذہب
مرنے پہ بھی ہوتا ہے سہارا درکار

(۲)

خود مشکلیں اپنے لئے پیدا نہ کرلے
خواہش تو کر لے خواہشِ بیجا نہ کرے
آساں نہیں تکمیلِ تمنا آصفؔ
بہتر ہے کہ انسان تمنا نہ کرے

●●●

رُباعیات

فراقِ گورکھپوری

(۱۸۹۶ء - ۱۹۸۲ء)

(۱)

نہلا کے چھلکے چھلکے نرمل جل سے
الجھے ہوئے گیسوؤں میں کنگھی
کس پیار سے دیکھتا ہے بچہ منہ کو
جب گھٹنوں میں لے کے پنہاتی ہے کپڑے

(۲)

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری
ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ، آنکھوں میں رس، ہاتھوں میں
بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

(۳)

اے معنیٔ کائنات مجھ میں آجا
اے رازِ صفات و ذات مجھ میں آجا
سوتا سنسار جھلملاتے تارے
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

●●●

رباعیات

جوش ملیح آبادی

(۱۸۹۴ء - ۱۹۵۸ء)

(۱)

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوب سخن کا نیا نکالا ہم نے
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

(۲)

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن، کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کی روایات کا بار

(۳)

اب خواہش لذت نہیں ہوسکتی
اب دن کے سوا رات نہیں ہوسکتی
در کس لئے کھٹکھٹا رہی ہے دنیا
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہوسکتی

(۴)

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری
بے چارے کی ایک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری

(۵)

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھا دینا
سو بار جہنم میں جلانا یارب!
معشوق کہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ"
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب!

●●●

رُباعیات

عبدالغفور شہباز

(۱۸۵۸ء - ۱۹۰۸ء)

(۱)

کیوں ہم بشری جمال پیدا کرتے
کیوں ہم ملکی کمال پیدا کرتے
دنیا کے شفاخانے میں ہوتے مرہم
ہر زخم میں اندمال پیدا کرتے

(۲)

اخلاق کے عنصر ہوں اگر اصل مزاج
جو قوم ہو ہو کبھی نہ محتاج علاج
ہو اس سے ہمیشہ خرقِ عادت کا ظہور
حاصل ہو اُسے عمرِ ابد کی معراج

(۳)

لوگوں کے خیالات میں ہے کیوں یہ جمود
کیا پیش نہیں مسئلہ نام و نمود
آئیں یہ نکل زاویۂ عزلت سے
قائم یہ کریں تہمتِ عالی کا عمود

●●●

رُباعیات

عبدالغفور خاں نساخ

(۱۸۳۳ء - ۱۸۸۹ء)

(۱)

عبرت کا مقام ہے یہ دہر فانی
نیرنگ میں ہے طبیعت انسانی
نساخ اس انقلاب کو دیکھ بغور
ثانی اول ہے اور اول ثانی

(۲)

کیا کام ہے اس سے کہ بہار آجائے
کچھ اس سے غرض نہیں کہ یار آجائے
ہو وصل مجھے یا کہ عدو کو ہو فراق
مطلب ہے یہی دل کو قرار آجائے

(۳)

جس راہ پہ چلتے ہیں یہ اہلِ تقلید
ہے وہی رہِ سنت و راہِ توحید
اس راہ پہ جو چلا نہ ہوگا گمراہ
پائے گا نجات ہے یہ اللہ سے اُمید

●●●

رُباعیات

میر ببر علی انیس

(۱۸۰۱ء - ۱۸۷۴ء)

(۱)

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا
بجز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوگا انیسؔ
ہم ہوں گے اور قبر کا کونا ہوگا

(۲)

گلشن میں پھروں یا سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

●●●

اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے — گر سر بہ ہوا ہووے ترا تیر ہوائی
ہر کوہ اگر کوہ صفا ہو تو عجب کیا — ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی
ہو بلکہ صف ایسی کہ دل سنگ صنم میں — ہر بت میں کرے صورت حق جلوہ نمائی
ہر شعر غزل میں ترے معنی شفا ہیں — قربان غزل کے تری دیوان شفائی
مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل — پروانے کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی
زنجیر میں جوہر کی رہی تیغ ہمیشہ — خوں ریز کو ہو، عہد میں تیرے نہ رہائی
دیتا ہے دعا ذوق کہ مضمون ثنا میں — ہے ذہن رسا کو، یہ کہاں اس کے رسائی

ہر سال شہا ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

●●●

خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور — زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ریائی
کرتی ہے صبا آ کے کبھی مشک فشانی — کرتی ہے نسیم آ کے کبھی لخلخہ سائی
تھا سوزنیِ خار کا صحرا میں جہاں فرش — سبزے نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی
آرائش گل کے لیے ہے جامۂ رنگیں — زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل — برگِ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی
ابرو پہ کرے قوسِ قزح وسمہ تو خورشید — سرخیِ شفق سے، کرے ریش اپنی حنائی
رُخسارۂ گل چیں کا، ہے سرخی سے یہ عالم — جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی
کیا ساغرِ رنگیں کو کیا جلد مہیا — نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں، اک ساغر گل کی — شاخِ گلِ احمر کی نزاکت سے کلائی
اعجازِ نوا سنجیِ مطرب سے چمن میں — ہر خار کے ہے نوک زباں شعرِ نوائی
حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر — ہر طائرِ تصویر، کرے نغمہ سرائی
شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کی رونق — عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی
پرتو سے ترے، جامِ مئے عیش سر بزم — لے ساغرِ جمشید، کرے کارروائی
کیا علم سمائے ترا، سینے میں فلک کے — دریا کی کہاں ہو سکے کاسے میں سمائی

پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلعِ موزوں
احسنت، کہیں سن کے بہائی و سنائی

یوں کرسیِ زر پر ہے، تری جلوئی نمائی — جس طرح سے مصحف ہو سر رحل طلائی
رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا، سامنے جس کے — ہے بحر بھی کشتی بہ کف از بہرِ گدائی
گمرہ کو ہدایت جو تری راہ پہ لادے — رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی
تا ناخنِ شمشیر، نہ ہو ناخنِ تدبیر — دشمن کی ترے ہو نہ کبھی عقدہ کشائی
خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدے کا روشن — گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی
عکسِ رُخِ روشن سے ترے جوں یدِ بیضا — کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی
کرتا ہے تری نذر سدا نقدِ سعادت — ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

قصیدہ در مدح ابوظفر بہادر شاہ

شیخ محمد ابراہیم ذوق
(۱۷۸۹ء - ۱۸۵۴ء)

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروے پُرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادے سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کی حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشے میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اُڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ ممیّز کرۂ ناری و مائی

پہنچا کمکِ لشکر باراں سے ہے یہ زور
ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزمِ عماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی

سردی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک
معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش سے عالم
ہے مدرسے میں بھی سبق صرفِ ہوائی

تا ابد طرز سخن کی ہے میری رنگینی
جلوہ رنگ چمن جائے گا ایک آن میں ڈھل

نام تلخی نہیں مجھ نطق میں جز شیرینی
یک طرف نار گلستاں میں ہے یک سو حنظل

ہیں برومند سخن ور میری ہر مصرع سے
مصرع سرو سے پایا ہے کسی نے بھی پھل

ہو جہاں کے شعرا کا میرے آگے سرسبز
نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل

ہے مجھے فیضِ سخن اُس کی ہی مداحی کا
ذات پر جس کی مبرہن کنہِ عز و جل

مہر سے جس کی منور ہے دل جوں خورشید
روسیہ کینے سے جس کے رہے مانند زحل

بغض جس کا کرے جوں مور سلیماں کو ضعیف
مور کو جب سے ملے جس کے بلوں کا سابل

جائے وصلت بہ نبی جس کو نہ دی غیر از عرش
فرشِ گلزارِ زمیں حق نے سمجھ مستعمل

شیرِ یزداں شہِ مردانِ علی عالی قدر
وصیِ ختمِ رُسل اور امامِ اول

خاکِ نعلین کی جس کی بدد طالع سے
پہنچے اس شخص کو جو شخص ہو اعمائے ازل

وہ نظر آئے اُسے دہر کی بینائی سے
رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل

مدحِ غایب سے کھلے اس کی نہ مداح کا دل
روبرو مطلعِ ثانی سے یہ ہو عقدہ حل

●●●

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و جبل

حدّ ایام کی پیش از مدد نامیہ سے
بچہ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل

سبز ہوتا ہے فصیحی کی سخن سے ہر بار
جو زبان سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل

دستِ گل خوردہ و شاخ گل گلزار بہم
بیجاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل

غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ
گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہوا کسی طرح کا حل

آوے ہے ایکے نظر لاکھ طرح کا وہ گل
ان گلوں چھٹ جو نکہہ کے ہیں سدا مستعمل

یاسمیں رنگ و جو رکھتی ہے خزاں سے مانند
چاہتی ہے بہ ساجت کرے سبزے سے بدل

چشمِ نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپے
غنچۂ لالہ لے سرمے سے بھرے ہیں مکحل

اس قدر محوِ تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشمِ سیار گلستاں میں جھپکتی نہیں بل

آبجو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحہ پر طلائی جدول

سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر یک گل پر
ساغرِ لعل میں جوں کیجیے زمرد کو حل

سنگ نے رعبۂ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی بسکہ ہو اسے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے
گل کو دیکھو تو نکہہ جاتی ہے سنبل پہ پھسل

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

اتنی ہے کثرتِ لغزش بزمینِ ہر باغ
جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل

فیضِ تاثیر ہوا ہے یہ کہ اب حنظل سی
شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل

دانہ جس شور زمیں پر نہ پھلا دہقاں سے
سبز واں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کشت کرنے میں ہر ایک تخم سے از فیض ہوا
گرتے گرتے بہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل

سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گل رو
خواہ ہو شیخ پشر خواہ وہ فرزند مغل

جوہری کو چمنستانِ جہاں میں اس فصل
آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از لطف ہوا سبز شود در مقل

نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے
مے فضا اس کی تو دو چار ہی دن میں فیصل

اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام
رہے گا سبز بہر مجمع و ہر یک دنگل

قصائد

قصیدہ باب الجنّت در منقبت امیر المومنین

مرزا محمد رفیع سودا

(۱۷۱۳ء - ۱۷۸۰ء)

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردے نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمر دار ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرم عزّ و جل

قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل

واسطے خلعتِ نو روز کے ہر باغ کی
آبجو قطع گلی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گلِ نورستہ کی رنگ آمیزی
پوششِ چھٹ قلمکار بہر دشت و جبل

عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
کارِ نقاشیِ مانی ہے دوم وہ اوّل

تار بارش میں پروتی ہیں گہر ہائے تکرک
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار سے آبِ رواں عکسِ ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بے کل

شاخ میں گل کے نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوشِ روئیدگیِ خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں کاوِ زمیں کے بھی جو پھوٹی کونپل

دمِ عیسیٰ میں فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دہن میں قسمِ جمادات سے شاید ہو خلل

گھر گھر یہی ذکر تھا ، یہی شور خارج ہوا نورِ دیدۂ کور
آیا کوئی لے کے نسخۂ نور لایا کوئی جا کے سرمۂ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہے وہی ، خدا جو چاہے مختار ہے ، جس طرح نبا ہے

جانا چاروں شاہ زادوں کا بہ تجویزِ کحّال تلاشِ گُل بکاؤلی کو

پایا جو سفید چشمِ صفا یوں میلِ قلم نے سرمہ کھینچا
تھا اک کحّالِ پیرِ دیریں عیسیٰ کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں
وہ مردِ خدا بہت کراہا سلطاں سے ملا ، کہا کہ شاہا!
ہے باغِ بکاؤلی میں اِک گُل پلکوں سے اُسی پہ مار چنگل
خورشید میں یہ ضیا کرن کی ہے مہر گیا اُسی چمن کی
اُس نے تو گُلِ ارم بتایا لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا
شہ زادے ہوئے وہ چاروں تیار رُخصت کئے شہ نے چار ناچار
شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ لشکر ، اسباب ، خیمے ، خرگاہ
وہ بادیہ گردِ خانہ برباد یعنی تاج الملوکِ ناشاد
میدان میں خاک اُڑا رہا تھا دیکھا تو وہ لشکر آرہا تھا
پوچھا ، تم لوگ خیل کے خیل جاتے ہو کدھر کو صورتِ سیل؟
بولا لشکر کا اک سپاہی جاتی ہے اِرم کو فوجِ شاہی
سلطان زین الملوکِ شہ زور دیدارِ پسر سے ہو گیا کور
منظورِ علاجِ روشنی ہے مطلوب گُلِ بکاؤلی ہے
گُل کی جو خبر سنائی اُس کو گلشن کی ہوا سمائی اُس کو
ہمرہ کسی لشکری کے ہو کر قسمت پہ چلا یہ نیک اختر

●●●

نقطے ہوں سپید خوش بیانی جدول ہو حصارِ سحر خوانی
جو نکتہ لکھوں ، کہیں نہ حرف آئے مرکز پہ کشش مری پہنچ جائے

داستان تاج الملوک شاہ زادے اور زین الملوک بادشاہِ مشرق کی

رودادِ زمانِ پاستانی یوں نقل ہے خامے کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ سلطان زین الملوک ، ذی جاہ
لشکر کش و تاج دار تھا وہ دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دیے تھے چار فرزند دانا ، عاقل ، زکی ، خردمند
نقشا ایک اور نے جمایا پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
اُمید کے نخل نے دیا بار خورشیدِ حمل ہوا نمودار
وہ نور کہ صدقے مہرِ انور وہ رُخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو چشمک تھی نصیب اُس پدر کو
خوش ہوتے ہیں طفلِ مہہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو
نظروں سے گرا وہ طفلِ ابتر مانندِ سرِ شکِ دیدۂ تر
پردے سے نہ دایہ نے نکالا پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
تھا افسرِ خسرواں وہ گل فام پالا تاج الملوک رکھ نام
جب نام خدا جواں ہوا وہ مانندِ نظر رواں ہوا وہ
آتا تھا شکار گاہ سے شاہ نظارہ کیا پدر نے ناگاہ
صاد آنکھوں کے دیکھ کر پسر کی بینائی کے چہرے پر نظر کی
مہرِ لبِ شہ ہوئی خموشی کی نورِ بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا اُس ماہ کو شہر سے نکالا

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں....

پنڈت دیا شنکر نسیم

(۱۸۱۱ء - ۱۸۴۳ء)

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یک سر حمدِ حق و مدحتِ پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنج تن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی کرتا ہے زباں کی پیش دستی

خواستگاری جنابِ باری سے
مثنوی گلزارِ نسیم کی ترتیب کے واسطے

یارب! مرے خامے کو زباں دے منقارِ ہزار داستاں دے
افسانہ گلِ بکاؤلی کا افسوں ہو بہارِ عاشقی کا
ہر چند، سنا گیا ہے اس کو اُردو کی زبان میں سخن گو
وہ نثر ہے، دادِ نظم دوں میں اُس مے کو دو آتشہ کروں میں
ہر چند، اگلے جو اہلِ فن تھے سلطانِ قلمرو سخن تھے
آگے اُن کے فروغ پانا سورج کو چراغ ہے دکھانا
پر، بحرِ سخن سدا ہے باقی دریا نہیں کار بندِ ساقی
طعنے سے زبانِ نکتہ چیں روک رکھ لے مری اہلِ خامہ میں نوک
خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر نیرنگ نسیمِ باغِ کشمیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہنچے ورنہ کیا بس ہے جو نہیں پہنچے
کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا مینا تو ایک بابت ہے پودنا پُھدکے تو قیامت ہے
کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار تھرتھراوے بھنبھیری سی دیوار
ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا
شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

●●●

تس کو پھر پرچھتی بھی ہٹی نہیں
ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں

ڈھانکو دیوار یا اُٹھا رکھو
یا ہمارے لئے بچھا رکھو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق
سو شکستہ تر از دلِ عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر سے کسو چھچھوندر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھر کا

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے
کہیں جھینگر کے لیے مزہ نالے

کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں
پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے
جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے

رکھ کے دیوار ایدھر اُودھر سے
لا کے یارب بناؤں کس گھر سے

چارپائی جب اس میں بچھوائی
پہلے چل پا سر ہی نظر آئی

سام ابرص کی ہے دوائے خراج
ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج

پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے
ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے

آگے اُس حجرے کے ہے اک ایوان
وہی اس ننگ خلق کا ہے مکان

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ
اُس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھو کوئی سنپو لیا ہے پھرے
کبھی چھت سے ہزار پائے گرے

کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے
کوئی وا سا کہیں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدنظر
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم
تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم

مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت
ہر کڑی نے کڑی اُٹھائی بہت

پر سے اس مینھ میں کرختی ہے
تختے تختا ہوئے یہ سختی ہے

ہوئیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد
چل ستوں سے مکان دے ہے یاد

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

در ہجو خانہ خود

میر تقی میر

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے

کوچۂ موج سے بھی آنگن تک
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم
تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم

نونی لگ لگ کے جھڑتی ہے مائی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھمے مینھ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے

جا نہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ
ہے چکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھرلا کے یہ کہے ہیں سب
کیوں کہ پردا رہے گا یارب اب

جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات

باؤ میں کانپتی ہیں جو تھر تھر
ان پہ ردّا رکھے کوئی کیوں کر

کیچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے
چھوپا کا ہے کو بلکہ تھوپا ہے

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ
محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ

محبت سے ہے انتظامِ جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں

محبت سے روتے گئے یار خوں
محبت سے ہو ہوگیا ہے جنوں

محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو
محبت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو

محبت سے پروانہ آتش بجاں
محبت سے بلبل ہے گرمِ فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لئے گُل ہے سرگرمِ ناز

محبت ہی ہے تحت سے تافوق
زمیں آسماں سب ہیں لبریزِ شوق

محبت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد
دلوں میں محبت سے اُٹھتے ہیں درد

گیا قیسؔ ناشاد اس عشق میں
کھپی جانِ فرہادؔ اس عشق میں

ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ
کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ

سنا ہوگا وامقؔ پہ جو کچھ ہوا
قتل اس عشق میں کس طرح سے ہوا

جو عذراؔ پہ گذرا سو مشہور ہے
وِمنؔ کا بھی احوال مذکور ہے

ستم اس بلا کے ہی سہتے گئے
سب اس عشق کو عشق کہتے گئے

اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں
یہی ذرّے کی جان نومید میں

اسی سے دلِ ماہ ہے داغ دار
کتاں کا جگر ہے سراسر فگار

نئے اس کے چرچے حکایت سنی
گہے شکر گاہے شکایت سنی

اسی سے قیامت ہے ہرچار اُور
اسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور

کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں
نہ ہو اس سے آشوبِ محشر عیاں

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی
کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار
غرض ہے یہ عجوبۂ روزگار

●●●

شعلۂ عشق

میر تقی میر

(۱۷۲۲ء - ۱۸۱۰ء)

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت ، نہ ہوتا ظہور

محبت مسبب محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کارِ عجب

محبت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبت سے خالی نہ پایا کوئی

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ
محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ

محبت اگر کار پرداز ہو
دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو

محبت ہے آبِ رُخِ کارِ دل
محبت ہے گرمیِ آزارِ دل

محبت عجب خواب خوں ریز ہے
محبت بلائے دل آویز ہے

محبت کی ہیں کار پردازیاں
کہ عاشق سے ہوتی ہیں جاں بازیاں

محبت کی آتش سے اخگر ہے دل
محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل

محبت کو ہے اس گلستاں میں راہ
کلی کے دلِ تنگ میں بھی ہے چاہ

محبت ہی سے دل کو رو بیٹھئے
محبت میں جی مفت کھو بیٹھئے

کہ ہنس نمنے بیچ سمدیک جانے تو مرے ڈوب تل سر اوپر پانو ہو
نکو بول مضمون توں ہور کا کہ کالا ہے دو جگ میں موں چور کا
چتا چوری کر چورا پے ساؤ ہوے دغا باز اچھنے کوں مانے نہ کوی
چرا کر چراتا نہ گھر چور کوی یو باتاں سمجھتے سو ہیں ہور کوی
نہ منج کچ بڑای نہ منج لاف ہے ولے عارفاں پاس انصاف ہے
جنم گر وندی رشک تے تلملے عنایت کے کاماں ستے کیا چلے
دکھن میں اتھیا لے طرح ہور میں دیا یوں سلاست کوں بھی زور میں
کہ فیروز آ خواب میں رات کوں دعا دے کے چومے مرے ہات کوں
کھیا ہے توں یو شعر ایسا سرس کہ پڑنے کو عالم کرے سب ہوس
تو یوں کر کے خصلت یو تج آئے نا کہ توں خوش اچھے ہور کسے جاے نا
توں ایسی طرز دل تے پنچا توی کہ دسرے کریں سب تری پیروی
وجہی ترا ذہن جیوں برق ھے تجے ہور بعضیاں میں نی فرق ہے
ترا شعر سن دل پگھلتا ہے یوں کہ پانی تے اہلوچ گلتا ہے جیوں
توں وجہی کھیا شعر نی دھات کا ہوا ز یاست تج تے مزا بات کا

شعر بولنا گرچہ اپروپ ہے
ولے خامنا کہنے تے خوب ہے

●●●

ہنر دیک سکتا ہے استاد کا　　فہم چور ہے آدمی زاد کا
کہیں پند کی بات اس دھات نیں　　یو پند ہے یہاں کرنے کی بات نیں
اگر کس تے تل خاص کچ جانتا　　اسے دل میں استاد کر مانتا
نہوسی ہنر اس وضا کس ستی　　نہ کرسی قدم کوی انگے اس ستی
اگر کوی گیانی چتر گیان ہے　　بدی یانچ کو یانچ میدان ہے
دے پرگٹ ہو عزت اس بات کا　　کہ درپن نجھاے کنگن ہات کا
دکھن میں جو دکھنی مٹھی بات کا　　ادا نیں کیا کوی اس دھات کا
ادا یوں اتال ہوے تو کیا عجب　　کہ عالم سنیا ہے یو چو پھیر سب
جو عاقل ہے یو بات جانے وہی　　قدر اس ادا کی پچھانے وہی
دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کا　　کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار آ
کہاں بات وو چنچل ہور چلبلی　　کہ دل کوں نھواں سوں کرے گدگلی
مری بات سن بات اس دھات بول　　کہ جیو کوں خوشی ہور دل کوں کلول
یو نرمول ہے بات اسے بول نیں　　ہر یک بول ہے وحی یو بول نیں
سخن گو وہی جس کی گفتار تھے　　اُچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے
یو بولیا ہوں سب گنج نارنج ہے　　اجھوں میرے دل میں بہوت گنج ہے
جو یک برس کوی سر لیوے رنج کوں　　نہ پاویں کدھیں اس چھپے گنج کوں
ہوا جیو جب شعر یو بولنے　　خزینے لگیا غیب کے کھولنے
رتن یو اتھے دل کیرے کھان میں　　وہاں تے لے آیا ہوں دکان میں
گہر یو مرے یوں لگے جھمکنے　　کہ پانی ہو گئے موتی سیپیاں منے
اگر غوطے لک برس غواص کھائے　　تو یک گوہر اس دھات امولک نہ پائے
یو موتی نہیں وو جو غواص پائیں　　یو موتی نہیں وو جو کس ہات آئیں
غواصاں کئی غوطے کھا کھاے کر　　موے ہیں سو اس سمد میں آئے کر
اپے ہو کہ لیا نا سو ہے جھوٹ سب　　خدا غیب تے دیوے تو کیا عجب

ہنر مشکل اس شعر میں یوچ ہے — کہ تھوڑے اچھیں حرف معنی سو لے
جو معنی ہے معشوق بھو دھات کا — پنا یا ہوں کسوت اسے بات کا
نہ پہنچے نہ پہنچیا ہے گن گیان میں — سو طوطی منج ایسا ہندستان میں
کہ باتاں یو سن کر مری گیان کیاں — رھیاں ٹھک ہو قمریاں خراسان کیاں
جتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے — سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے
کہ فیروز ، محمود اجتے جو آج — تو اس شعر کوں بھوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونوں بی اس کام میں — رکھیا نیں کہنے بول اجھوں نام میں
یو سب شعر کہتے یو سب شعر نیں — کہ بولاں کدھر ہور معنی کہیں
شعر گرچہ لئی لوگ جوڑے اہیں — بُرے بھوت ہور خوب تھوڑے اہیں
دو جگ جس اُتم ہیرے کا مول ہے — دو ہیرا سو ہر ایک مرا بول ہے
رتن بے بدل یو مرے جاں بکائیں — وہاں چاند سورج دلالی نہ پائیں
بچن موتی یو دیکھ نپٹ لاج تے — سمد پانی گل کر ہوا لاج تے
کہ مانک موتی یو اتم ذات کے — نہیں دیکھیا میں کیں اس دھات کے
جو کوی جوہری ہے سو پچھان کر — منگے گارتن کوں قدر جان کر
پرکھ دیک توں کاچ ہور پاچ کوں — برابر نہ کر دود ہور چھاچ کوں
جہاں پاچ اچھے گا وہاں کاچ کیا — جہاں دود اچھے گا وہاں چھاچ کیا
نہ یو بات ہر ایک کے ساتھ ہے — جکوی عارف ہے اُس سوں یو بات ہے
توں پھل چاک دیکھ ہور لذت کوں قام — نہ کر مول سب کا سکٹ تین دام
جو کرتا یکس کا ہنر دیک کر — ہنر وندا سے نیں کتے ہے ہنر
نوا دل تے لیا نا ہے مشکل کنا — کہ آسان ہے دیک کر بولنا
جکوی یوں کرے اس میں کچ قام نیں — ہنر دیک سکنا بڑا کام نیں
ہنروند اس کوں کھیا جائے گا — جکوی اپنے دل تے نوالیاے گا
فرق ہے اول ہور آخیر میں — تفاوت اے نیر ہور شیر میں

درشرح شعرگوید

ملّا وجہی

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات — کہ ہے فائدا اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے توں بتیاں پچیس — بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیرے بات میں — پڑیا جائے کیوں مجو لے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فام نیں — اسے شعر کہنے سوں کچ کام نیں
نکو کر تو لئی بولنے کی ہوس — اگر خوب بولے تو یک بیت بس

نولاسی ہور نازک کہاں ہور موسل جیسی لاٹ
چندن کیرے رتی بھلی نا بھارا بھر کر کاٹ

ہنر ہے تو کچ ناز کی برت یاں — کہ موٹاں نہیں باندتے رنگ کیاں
وو کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے — کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے
اگر فام ہے شعر کا تجکوں چھند — چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
دکھا ایک معنی اگر زور ہے — ولے کبھی مزا بات کا ہور ہے
اگر خوب محبوب جیو سو رہے — سنوارے تو نور علیٰ نور ہے
اگر لاک عیاں اچھے نار میں — ہنر ہو وسے خوب سنگار میں

اگر را جوٹ چکہ فرشتیاں سوں لاے تو نوکھن کی گڑ کیاں سو کیلیاں منگاے
سدا پادشاہی وو دھرتا ہے شہ انند عیش عشرۃ جو کرتا ہے شہ
سو بھو تیک امید ھور اس تی منگیا ایک فرزند خدا پاس تی
کہ فرزند تے نانو اچتا اھے اپر گئے تو ملی نانوں اچتا اھے
یہی بات پھر پھر کے کہتا اچھے اسی دھیان میں نت وہ رہتا اچھے
جو یک دیس اس شہ کوں فرزند ہوا وو فرزند اس کا سو دل بند ہوا
اپنے تیج لیا یا وو اپنے سنگات سکندر کے طالع خضر کی حیات
بدن سیم قد سرو جیوں راست ہے کہ صورت میں یوسف تی کیں زیاست ہے

●●●

مدح ابراہیم قطب شاہ گوید

ملّا وجہی

(پیدائش:۱۵۵۵ء)

ابراہیم قطب شاہ راجا دھراج — شہنشاہ ہے شاہ شاہاں میں آج
عدل بخشش ہور داد اس تی اچھے — سدا خلق سب شاد اس تی اچھے
جتے پادشاہاں ہیں سنسار کے — بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے
سلیماں تی فاضل ہے اس بخت بل — پری دیو، جن سب ہیں اس حکم تل
اپس عدل کے بل تی وو جگ ادھار — رکھیا باگ بکری ملا ایک ٹھار
دھرے حکم حکمت سوں چوندھیر شہ — جہاں سب لیا دو جہاں گیر شہ
تو یوں عدل اب جگ میں ہونے لگیا — کہ بھیس کا بھونک بھاڑ دو ہونے لگیا
اسے شاہ عادل کے غصے تی ڈر — لیا ہے گگن کوں پون پیٹ پر
یتا بل ہے اس عدل کے فن منے — کہ بجلیاں کھڑیاں کا پتیاں کھن منے
نبرتی ہیں یوں بجلیاں زیر بند — تو برساتے ہیں مھوں بدل رنگ کھنڈ
یتا داد انصاف بھور عدں تھا — کہ مرغابی کوں باز کا ڈر نہ تھا
کبوتر اول کے دنداں سار نے — سو بھری کوں لاتاں لگے مارنے

نانا یہ کلمہ گو ہمیں ناحق ستاتے ہیں پیتے ہیں خود ہمیں نہیں پانی پلاتے ہیں
انصاف کے لیے نہیں کیوں آپ آتے ہیں اتنا تو پوچھیے یو نہیں مہماں بلاتے ہیں
غلّہ سپاہِ شام میں تقسیم ہوتا ہے
کنبہ تمہارا تیسرے فاقے سے روتا ہے

سجادے پر مکیں تھے امام فلک مکاں تقسیمِ غلّہ کا جو سنا حال ناگہاں
ارزاں دیا رفیقوں کو وہ غلۂ گراں جس غلۂ گراں کے تھے نو دانے آسماں
گندم کے بدلے جنتِ آدم میں گھر دیا
گھر کیسا ، کائنات کا مختار کر دیا

واں غلہ دے کے سب سے مخاطب ہوا عمر کھا لو ، کہ اب غذا نہ ملے گی کئی پہر
اس جنگ میں ہراس و تردّد ہے سر بہ سر ایماں کا نقص ، جان کا خوف ، آبرو کا ڈر
اُمت سے سامنا ہے امامِ جلیل کا
کاٹا ہے جس کے باپ نے پر جبرئیل کا

ایک ایک اُن میں حمزۂ صاحب قرآن ہے آج بندہ حسینیوں کا ہے جو پہلواں ہے آج
اک اک علیؑ کی طرح شجاعِ جہاں ہے آج شہروں میں ان کی تیغ کا سکہ رواں ہے آج
ہاں ، صبح ہے قریب ، نہ کھانے میں دیر ہو
ان بھوکے پیاسے شیروں سے لڑنا ہے ، سیر ہو

بڑھ کر عمر سے کہنے لگے بانیِ ستم اپنی تو یہ غذا ہے کہ بھوکے رہیں حرم
نوفل پکارا سیر ہیں آب و غذا سے ہم کھائی ہے آج قتلِ علم دار کی قسم
چلّایا شمر ، ہم تو اُسی وقت کھائیں گے
جب تین دن کے پیاسے کا سر کاٹ لائیں گے

●●●

کھولے ہوا میں طائرِ زرّیں نے بال و پر بیٹھا وہ آ کے چرخ چہارُم کے بام پر
دانے ستاروں کے جو پڑے تھے اِدھر اُدھر منقارِ زر میں چن لئے اُس نے وہ سر بہ سر
گرمیِ حسن مہر سے آب آب ہو گیا
گردوں پہ خشک چشمۂ مہتاب ہو گیا

پر تھا ہمائے اوجِ سعادت شکستہ بال جز اشک آب و دانے کا تھا دیکھنا محال
تھا پیاس سے سکینہ و اصغر کا غیر حال منہ زرد، لب کبود، زباں خشک، آنکھ لال
وہ دودھ دودھ کہتا تھا رو کر اشارے سے
یہ پانی پانی کہتی تھی زہرا کے پیارے سے

تھے خرمنِ فلک پہ ابھی دانۂ نجوم بونے لگا جو تخمِ ستم ابنِ سعدِ شوم
غلّے کے بانٹنے کو ندا دی علی العموم مانندِ مور دانہ زدوں نے کیا ہجوم
جس کا کہ باپ قاسمِ رزقِ زمانہ تھا
ہفتم سے کربلا میں وہ بے آب و دانہ تھا

رومال ظالموں نے زمیں پر بچھا دیے حصّے عمر نے سب کے برابر لگا دیے
اور افسروں کو بدرے کے بدرے اُٹھا دیے اور سر بہ مہر صرّۂ زر بھی دکھا دیے
لب کھولے حیلہ ور کی عدالت کے جوش نے
گندم نمائی، آہ، کی یوں جو فروش نے

ہاں اے نمک حلالو، نہ ہمت کو ہاریو بھوکے کو بھوکا پیاسے کو پیاسا ہی ماریو
ابنِ معاویہ کی خلافت سنواریو سیّد کے سر کو سینے پہ چڑھ کر اُتاریو
اب تو ہے غلہ کل زر و جاگیر و مال ہے
شبّیر کو جو ذبح کرو، سب حلال ہے

زینبؑ نے رفتہ رفتہ جو یہ شور سن لیا بے ساختہ حسینؑ کے فاقے پہ رو دیا
جنگل کو رُخ کیا کبھی یثرب کو رُخ کیا آواز دی، کہاں ہو تم اے فخرِ انبیا!
قربان جاؤں، قبر میں اس شب کو سوتے ہو
یا کربلا میں اپنے نواسے کو روتے ہو

تھی صبح یا فلک کا وہ جیبِ دریدہ تھا یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہیے نہ مہر ، صبح کے سینے پہ داغ تھا
امید اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

روزِ سفید یوسفِ آفاق شب نقاب مغرب کی چاہ میں تھا جو پابندِ اضطراب
لقائے آسماں نے لیا دلوِ آفتاب جس میں رسن شعاع کی باندھی بہ آب و تاب
یوسف کو دلوِ مہر میں بٹھلا کے چاہ سے
مشرق میں لایا کھینچ کے مغرب کی راہ سے

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
کھولا سپیدیٔ نے جو مصلائے حریرِ صبح پھر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیرِ صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ دُرود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا پھر مشکِ شب ، جہان سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینے سے دور ہو گیا باطل رسالۂ شب دیجور ہو گیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کا ذرّوں کے نامے میں

جوزا عنانوں کے ہوئے جولاں جور اہوار سیارے بھولے سیر و تماشائے روزگار
تازی ہوئے جو صرفِ چراگاہ ایک بار باقی نہ کہکشاں کی رہی کاہِ زرنگار
برباد سبزۂ روشِ کہکشاں ہوا
پامال برج سنبلۂ آسماں ہوا

سگ خصلتانِ شام تھے مشغولِ خوابِ صبح شیرانِ شیرِ حق تھے شریکِ ثوابِ صبح
پیشِ نگاہ وہ ورقِ انتخابِ صبح تھا جس ورق پہ مصحفِ نور آفتابِ صبح
شانِ نزولِ سورۂ والفجر یاد تھی
مشتاقِ بہشت تھی فکرِ جہاد تھی

مرثیہ

مرزا سلامت علی دبیر

(۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء)

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی مجنوں صفت، قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

فرہادِ مہر نے یہ کیا طور اختیار اس کوہِ بے ستونِ فلک پر لیا قرار
تیشہ لگا کے خطِ شعاعی کا آب دار کی، جوئے شیرِ صبح، سیاہی سے آشکار
لیکن عجیب حال تھا بے شیرِ شاہ کا
نہرِ لبن میں شور تھا وااصغراہ کا

یوسف غریقِ چاہ سیہ ناگہاں ہوا یعنی غروب ماہِ تجلی نشاں ہوا
یونس دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا یعنی طلوع نیرِ مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

غش ہوگئی سن کر یہ بیاں زینبؑ پُرغم خیمے میں اسی رات سے برپا ہوا ماتم
بے دار رہیں صبح تلک بیبیاں باہم خیموں کو اکھڑوا کے چلے قبلۂ عالم
آخر وہی صحرا ، وہی جنگل نظر آیا
تھی دوسری تاریخ کہ مقتل نظر آیا

اُترے اسی میدان بلا خیز میں سرور استادہ ہوئے ، خیمۂ ناموسِ پیمبر
صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہوگئے اکبر دریا پہ ٹہلنے لگے عباسِ دلاور
شہہ بولے ہوا نہر کی بھائی تمھیں بھائی
ہاں شیر ہو دریا کی ترائی تمھیں بھائی

●●●

یہ آل نبی کی ہے مصیبت کا مہینا یہ ظلم کا عشرہ ہے یہ آفت کا مہینا
پہنچا ہے غریبوں کی شہادت کا مہینا آخر ہے بس اب عمر کی مدت کا مہینا
یہ بارِ امامت مری گردن سے اُتر جائے
ہو خاتمہ بالخیر جو سر تن سے اُتر جائے

گردوں پہ مہہ نو جو نمایاں ہے یہ ہمشیر چڑھتی ہے مرے سر کے لئے چرخ پہ شمشیر
اس چاند میں کٹ جائے گا سب لشکرِ شبیرؑ نیزہ کوئی کھائے گا کلیجہ پہ ، کوئی تیر
برچھی کسی جانباز کے پہلو میں لگے گی
شمشیر ، کسی شیر کے پہلو میں لگے گی

خیمے کو جلا دیں گے ، لٹے گا زر و زیور اس ماہ میں ہوں گے نہ پدر اور نہ برادر
ماؤں سے پسر چھوٹیں گے بہنوں سے برادر بیوہ کئی سیدانیاں ہوویں گی مقرر
گھڑکیں کے ستم گار جو رووے گی سکینہ
اس ماہ میں بے باپ کی ہووے گی سکینہ

دولھا کوئی ٹاپوں کے تلے ہوئے گا پامال پیٹے گی کوئی تازہ دلہن کھولے ہوئے بال
تیروں سے کسی ماں کا جگر ہوئے گا غربال نکلے گی کوئی کہتی ہوئی ہائے مرا لال
معصوموں کے سونے کی جگہ پائیں گی خالی
بچوں سے بھری گودیاں ہو جائیں گی خالی

اس عشرۂ اول میں نہ ہوئیں گے بہن ہم تاریخِ سفر ہے دہمِ ماہِ محرم
عشرہ یہ وہ عشرہ ہے کہ اے زینبِ پُرغم جس لال کی عاشق ہو وہ ہو جائے گا بے دم
دیکھو گی نہ پھر منہ علی اکبر سے پسر کا
اب شام میں ہوئے گا تمھیں چاند صفر کا

رونے کے لئے حق نے بنائے ہیں یہ دس دن ان روزوں خوشی ہو یہ کسی کو نہیں ممکن
لیویں گے مرا تعزیہ ہر شہر کے ساکن اکبر کو جواں روئیں گے معصوموں کو کم سن
بھولیں ہمیں ایسے نہیں غم خوار ہمارے
ہوئیں گے سیہ پوش عزا دار ہمارے

اس دن سے تو اک ابر ستم فوج پہ چھایا کھانا کئی دن قافلہ والوں نے نہ کھایا
رستے میں ابھی تھا اسداللہ کا جایا جو چاند محرم کا فلک پر نظر آیا
سب نے مہِ نو لشکرِ شبّرؑ میں دیکھا
منہ شاہ نے آئینہ شمشیر میں دیکھا

خویش و رفقا چاند کی تسلیم کو آئے مجرے کو جھکے اور سخن لب پہ یہ لائے
یہ چاند مبارک ہو یداللہ کے جائے کفار پہ تو فتح ، اسی چاند میں پائے
رتبہ مہ و خورشید سے بالا رہے تیرا
تاحشر زمانے میں اُجالا رہے تیرا

حضرت نے دعا پڑھ کے یہ کی حق سے مناجات کر رحم گنہ گاروں پہ اے قاضیِ حاجات
سر دینے کا مشتاق ہوں عالم ہے تری ذات خنجر مری آنکھوں میں پھرا کرتا ہے دن رات
باقی ہیں جو راتیں وہ عبادت میں بسر ہوں
یہ زیست کے دس دن تری طاعت میں بسر ہوں

پہنچا دے مجھے جلدی بس اے خالقِ افلاک اس خاک پہ جس خاک سے ملتی ہے مری خاک
طالب ہے ترے قرب کا سبطِ شہِ لولاک نہ ملک کی خواہش ہے نہ درکار ہے املاک
بے تاب ہے دل صبر کا یارا نہیں مجھ کو
اب فصل بجز وصل گوارا نہیں مجھ کو

اتنے میں یہ فضہ علی اکبر کو پکاری لو دیکھ چکی چاند ید اللہ کی پیاری
عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمہاری آنکھوں کو کئے بند یہ فرماتی ہیں واری
آئے تو رخِ اکبر ذی قدر کو دیکھوں
شکل مہِ نو دیکھ چکی بدر کو دیکھوں

شہ داخلِ خیمہ ہوئے فرزند کے ہمراہ منہ دیکھ کے یوں کہنے لگی بنت یداللہ
یہ چاند ہے کس طرح کا اے فاطمہؑ کے ماہ فرمانے لگے رو کے بہن سے شہِ ذی جاہ
سر تن سے مرا اس مہِ پُرغم میں کٹے گا
زینبؑ یہ مہینہ تمھیں ماتم میں کٹے گا

اک شیر ترائی میں یہ چلاتا ہے دن رات کٹ جائینگے یاں ہاتھ مرے لال کے ہیہات
کیا حال کہوں نہر کا، اے شاہِ خوش اوقات پانی تو نہیں شور، پہ مشہور ہے یہ بات
طائر بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں پیتے
وحشی کبھی واں آن کے پانی نہیں پیتے

اس جا نہ اترتا ہے نہ دم لیتا ہے رہ گیر ہے شور کہ اس آب میں ہے آگ کی تاثیر
پیاسوں کے لئے اس کی ہر اک موج ہے شمشیر اس طرح ہوا چلتی ہے جس طرح چلیں تیر
بجھتی نہیں واں پیاس کسی تشنہ گلو کی
بو آتی ہے اس نہر کے پانی میں لہو کی

اس شخص سے یہ کہہ کے چلے قبلۂ عالم اللہ نے چاہا تو بسائیں گے اسے ہم
عاشق پہ بلا بعد بلا آتی ہے ہر دم غم اور بڑھا، وصل کا عرصہ جو رہا کم
آفت یہ نئی فوج شہنشاہ میں آئی
مسلم کی شہادت کی خبر راہ میں آئی

غربت میں نہ ماتم کی سنائے خبر اللہ طاری ہوا حضرت پہ عجب صدمۂ جانکاہ
گوندھے ہوئے سر کھول کے پیٹے حرمِ شاہ فرماتے تھے شہ سب کو ہے درپیش یہی راہ
ہوگا وہی اللہ کو جو مدِّ نظر ہے
آج ان کا ہوا کوچ، کل اپنا بھی سفر ہے

وارث کے لئے زوجۂ مسلم کا تھا یہ حال محمل سے گری پڑتی تھی بکھرائے ہوئے بال
روتے تھے بہن کے لئے عباسؑ خوش اقبال وہ کہتی تھی ساتھ آئے تھے چھوٹے مرے دولال
پوچھو تو کدھر وہ مرے پیارے گئے دونوں
فرماتے تھے شبّرؑ کہ مارے گئے دونوں

محمل تھے سب اس بی بی کے ہودج کے برابر تھا شور کہ بیوہ ہوئی شبّرؑ کی خواہر
گھبرا گئی تھی مسلم مظلوم کی دختر ہر بار یہی پوچھتی تھی ماں سے لپٹ کر
کیوں پیٹتی ہو کون جدا ہو گیا امّاں
غربت میں مرے باپ پہ کیا ہو گیا امّاں

جاتے تھے دل افسردہ و غمگیں شہِ ابرار ہر گام پہ ہوتے تھے عیاں موت کے آثار
قبریں نظر آتیں کسی صحرا میں جو دو چار فرماتے تھے شہ فاعتبروا یا اولی الابصار
جز خاک نہ ہووے گا نشاں بھی بدنوں کا
انجام یہ ہے ہم سے غریب الوطنوں کا

احباب کہیں، گھر ہے کہیں، آپ کہیں ہیں آگے تو زمیں پر تھے پر اب زیرِ زمیں ہیں
خالی ہیں مکاں آپ تہِ خاک مکیں ہیں جو دور نہ رہتے تھے وہ اب پاس نہیں ہیں
حسرت یہ رہی ہوگی کہ پہنچے نہ وطن میں
کیا منہ کو لپیٹے ہوئے سوتے ہیں کفن میں

باتیں تھیں یہی یاس کی اور درد کی تقریر منزل پہ بھی آرام سے سوتے تھے نہ شبیر
شب کو کہیں اُترے، تو سحر کو ہوئے رہگیر جلدی تھی کہ، ہو جائے شہادت میں نہ تاخیر
مقتل کا یہ تھا شوق شہِ جن و بشر کو
جس طرح سے ڈھونڈھے کوئی معشوق کے گھر کو

ملتا تھا کوئی مرد مسافر جو سر راہ یوں پوچھتے تھے اس سے بہ حسرت شہ ذی جاہ
ایسا کوئی صحرا بھی ہے اے بندۂ اللہ اک نہر سوا جس میں ہو چشمہ نہ کوئی چاہ
کیا ملتا ہے، اس دشت میں اور کیا نہیں ملتا
ہم ڈھونڈھتے پھرتے ہیں، وہ صحرا نہیں ملتا

وہ عرض یہ کرتا تھا کہ سبطِ شہِ لولاک ہے سخت پر اندوہ، وہ صحرا تہِ افلاک
ہنستا ہوا واں جائے تو ہو جاتا ہے غمناک سنتا ہوں وہاں دن کو اُڑاتا ہے کوئی خاک
واں راتوں کو آتی ہے صدا سینہ زنی کی
درویش کی ممکن ہے سکونت نہ غنی کی

چلاتی ہے عورت کوئی ہے ہے مرے فرزند اس دشت میں ہو جائے گا تو خاک کا پیوند
تلواروں سے ٹکڑے یہیں ہونگے ترے دلبند پانی یہیں ہو جائے گا بچوں پہ ترے بند
پیارے تو اسی خاک پہ گھوڑے سے گرے گا
ہے ہے یہیں خنجر تری گردن پہ پھرے گا

چلاتی تھیں رانڈیں کہ چلی شہ کی سواری لے گا خبر اب کون مصیبت میں ہماری
آنکھوں سے یتیموں کی درِ اشک تھا جاری مضطر تھے اپاہج ضعفا کرتے تھے زاری
کہتے تھے گدا ، ہم کو غنی کون کرے گا
محتاجوں کی فاقہ شکنی کون کرے گا

تھا ، نا کے تلک شہر کے اک شورِ قیامت سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت پائیں گے کہاں ہم ، یہ غنیمت ہے زیارت
آخر تو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

قسمیں انہیں دے دے کے کہا شہ نے کہ جاؤ تکلیف تمھیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ
اللہ کو سونپا تمھیں آنسو نہ بہاؤ پھرنے کے نہیں ، ہم سے بس اب ہاتھ اُٹھاؤ
اس بے کس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہ سدھارے جو صاحبِ قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے
کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھار
اُترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں

روشن ہوئی کعبہ کی زمیں نورِ خدا سے مکہ نے شرف اور بھی پایا شرفا سے
جھک جھک کے ملے ، سبطِ پیمبر غربا سے آباد ہوا شہر ، نمازوں کی صدا سے
خوش ہو کے ہوا خواہ یہ کہتے تھے علیؑ کے
سب باپ کی خو بو ہے نواسے میں نبیؐ کے

کعبے میں بھی اک دن نہ ملا شاہ کو آرام کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام
اعدا نے گذرنے نہ دیے ، حج کے بھی ایام کھولا پسرِ فاطمہؑ نے باندھ کے احرام
عازم طرفِ راہِ الٰہی ہوئے حضرت
تھی ہشتم ذی الحجہ کہ راہی ہوئے حضرت

میں نے جو کہا قبر سے کیوں نکلے ہو باہر نہ سر پہ عمامہ ہے نہ ہے دوش پہ چادر
فرمایا کہ ماتم میں ہوں اے بنتِ پیمبر مرنے کو پسر جاتا ہے برباد ہوا گھر
ترسیں گے وہ پانی کو جو نازوں کے پلے ہیں
تلواریں ہیں اب اور مرے بچوں کے گلے ہیں

پھرتا ہے مری آنکھوں میں شبیرؑ کا مقتل وہ نہر فرات اور کئی کوس کا جنگل
وہ بجلیاں تلواروں کی اور شام کا بادل دریا سے وہ پیاسوں کے ہٹا دینے کی ہلچل
شبیرؑ کے سر پر سے یہ آفت نہ ٹلے گی
دسویں کو محرم کی چھری مجھ پہ چلے گی

سن کر یہ بیاں باپ کا مادر کی زبانی رو رو کے پکارا اسداللہ کا جانی
ہاں والدہ سچ ہے نہ ملے گا مجھے پانی پیاسے ہیں مرے خون کے یہ ظلم کے بانی
بچپن میں کیا تھا ، مرا ماتم شہِ دیں نے
نانا کو خبر دی تھی مری روح امیں نے

پہلو میں جو تھی فاطمہؑ کے تربتِ شبرؑ اس قبر سے لپٹے بہ محبت شہِ صفدر
چلائے کہ شبیرؑ کی رخصت ہے برادر حضرت کو تو پہلو ہوا اماں کا میسر
قبریں بھی جدا ہیں تہِ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لے جائے کہاں خاک ہماری

یہ کہہ کے چلے قبر حسنؑ سے شہِ مظلوم رہوار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم
یارانِ وطن گرد تھے افسردہ و مغموم چلاتے تھے خادم کہ چلا خلق کا مخدوم
خالی ہوا گھر آج رسولِؐ عربی کا
تابوت اسی دھوم سے نکلا تھا نبی کا

جب اُٹھ گئی تھیں خلق سے مخدومۂ عالم سر پیٹتے تھے لوگ اسی طرح سے باہم
برپا تھا جنازے پہ علیؑ کے یونہیں ماتم تھا رحلتِ شبرؑ میں محبوں کا یہی غم
بس آج سے بے وارث و والی ہے مدینہ
اب پنجتنِ پاک سے خالی ہے مدینہ

فرمایے اب جائے کدھر آپ کا شبیر یاں قید کی ہے فکر اُدھر قتل کی تدبیر
تیغیں ہیں کہیں میرے لئے اور کہیں زنجیر خوں ریزی کو کعبہ تلک آ پہنچے ہیں بے پیر
بچ جاؤں ، جو پاس اپنے بلا لیجیے نانا
تربت میں نواسے کو چھپا لیجیے نانا

یہ کہہ کے ملا قبر سے شہہ نے جو رُخِ پاک ہلنے لگا صدمے سے مزارِ شہہِ لولاک
جنبش جو ہوئی قبر کو تھرّا گئے افلاک کانپی جو زمیں صحنِ مقدس میں اُڑی خاک
اس شور میں آئی یہ صدا روضۂ جد سے
تم آگے چلو ہم بھی نکلتے ہیں لحد سے

باتوں نے تری دل کو مرے کردیا مجروح تو شہر سے جاتا ہے تڑپتی ہے مری روح
بے تیغ کیا ، خنجرِ غم نے ترے مذبوح ہے کشتیِ اُمت پہ تباہی ، کہ چلا نوح
افلاکِ امامت کا تجھے بدر نہ سمجھے
بے قدر ہیں ظالم کہ تری قدر نہ سمجھے

مارا گیا جس روز سے شبرؑ مرا پیارا اس روز سے ٹکڑے ہے کلیجہ مرا سارا
اب قتل میں ہوتا ہوں ترے ساتھ دوبارا اُمت نے کیا پاسِ ادب خوب ہمارا
زہراؑ کی جو بستی کو اُجاڑیں تو عجب کیا
اعدا مجھے تربت سے اُکھاڑیں تو عجب کیا

اس ذکر پہ رویا کیے شہ سر کو جھکائے واں سے جو اٹھے فاطمہؑ کی قبر پہ آئے
پائینِ لحد گر کے بہت اشک بہائے آواز یہ آئی کہ میں صدقے مرے جائے
ہے شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
پیارے میں اسی دن سے تڑپتی ہوں کفن میں

تربت میں جو کی میں نے بہت گریہ وزاری گھبرا کے علیؑ آئے نجف سے کئی باری
کہتے تھے اے احمدِ مختار کی پیاری تم پاس ہو تربت ہے بہت دور ہماری
گھر لٹتا ہے کیوں کر ہمیں چین آئے گا زہراؑ
کیا ہم سے نہ رخصت کو حسینؑ آئے گا زہراؑ

اک دن تو مہیا تھا ، یہ سامانِ سواری اک روز تھا وہ ، گرد تھے نیزے لئے ناری
محمل تھا ، نہ ہودج ، نہ کجاوہ ، نہ عماری بے پردہ تھی وہ حیدرؑ کرار کی پیاری
ننھے کئی بچوں کے گلے ساتھ بندھے تھے
تھے بال کھلے چہروں پہ اور ہاتھ بندھے تھے

زینت دہِ محمل جو ہوئی دخترِ زہراؑ ناقوں پہ چڑھے سب حرم سیّد والا
آنے لگے رہوار ، کھلا گرد کا پردا عباس سے بولے یہ شہِ یثرب و بطحا
صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے روحِ نبی پر
رخصت کو چلو قبرِ رسولِ عربی پر

ہے قبر پہ نانا کی مقدم مجھے جانا کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہو شہر میں آنا
امّاں کی ہے تربت پہ ابھی اشک بہانا اس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لئے جاتی ہے تقدیرِ وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

پیدل شہِ دیں روضۂ احمدؐ کو سدھارے تربت سے صدا آئی کہ آ آ مرے پیارے
تعویذ سے شبیرؑ لپٹ کر یہ پکارے ملتا نہیں آرام نواسے کو تمہارے
خط کیا ہیں اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

خادم کو کہیں امن کی اب جا نہیں ملتی راحت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی
دکھ کون سا اور کون سی ایذا نہیں ملتی ہیں آپ جہاں ، راہ وہ اصلا نہیں ملتی
پابندِ مصیبت ہوں گرفتارِ بلا ہوں
خود پاؤں سے اپنے طرفِ قبر چلا ہوں

میں اک تنِ تنہا ہوں ستم گار ہزاروں اک جان ہے اور درپئے آزار ہزاروں
اک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں اک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خوں ریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لئے تیز ہوئے ہیں

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
دنیا سے کوئی دن میں گذر جائے گی صغرا
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا

عباسؑ نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا چلنے کو ہے اب قافلہ تیار ہمارا
لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دوبارا اٹھے شہِ دیں ، گھر تہہ و بالا ہوا سارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پُرنم نظر آئی
اک مجلسِ ماتم تھی ، کہ برہم نظر آئی

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہِ ابرار روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فراشوں کو عباس پکارے یہ بہ تکرار پردے کی قناتوں سے خبردار! خبردار
باہر حرم آتے ہیں ، رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے آتا ہو ادھر جو وہ ، اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریمؑ سے سوا حق نے شرف ان کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

عباسِؑ علی سے علی اکبر نے کہا تب ہیں قافلہ سالارِ حرم حضرت زینب
پہلے وہ ہوں اسوار تو محمل میں چڑھیں سب حضرت نے کہا ہاں یہی مرا بھی ہے مطلب
گھر میں مرے زہراؑ کی جگہ بنتِ علیؑ ہے
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہے

پہنچی جو ہیں ناقے کے قریں دخترِ حیدر خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبر
فرزند کمر بستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

کیا گذرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
تشریف خدا جانیے کب لاؤ گے بھائی کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی
کیا دم کا بھروسہ کہ چراغِ سحری ہیں
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا صحت سے جو ہیں ان میں کہاں میرا ٹھکانا
بھیا جو اب آنا تو مری قبر پہ آنا ہم گور کی منزل کی طرف ہوں گے روانا
کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمہاری ہے تو یہ راہ ہماری

مرنا تو مقدم ہے، غم اس کا نہیں زنہار دھڑکا ہے کہ جب ہونگے عیاں موت کے آثار
قبلہ کی طرف، کون کرے گا رُخِ بیمار یٰسین بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غمخوار
سانس اُکھڑے گی جس وقت تو فریاد کروں گی
میں ہچکیاں لے لے کے تمھیں یاد کروں گی

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قربان گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
بے کس مری بچی، ترا اللہ نگہبان صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبے کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی تپ ہے تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بے کس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

سب بیبیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر چھاتی سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو، کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بے کس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ اکبر کو بلاؤ، علی اصغر کو بھی، لاؤ
آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ روٹھی ہے بہن تم سے گلے اس کو لگاؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کرلو
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کرلو

پاس آن کے اکبر نے یہ کی پیار کی تقریر کیا مجھ سے خفا ہوگئیں صغرا مری تقصیر
چلانے لگی، چھاتی پہ منہ رکھ کے، وہ دلگیر محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اُتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے تلوار لئے شان سے چلنے کے میں صدقے
افسوس سے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے کیوں روتے ہو اشک آنکھوں سے ڈھلنے کے میں صدقے
جلد آن کے بہنا کی خبر لیجیو بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

لکھنا مجھے نسبت کا اگر ہو کہیں سامان حق دار ہوں میں نیگ کی میرا بھی رہے دھیان
اور مر گئی پیچھے، تو رہے دل میں سب ارمان لے آنا دولھن کو مری تربت پہ، میں قربان
خوشنود مری روح کو کر دیجیو بھائی
حق نیگ کا تم قبر پہ دھر دیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہ رو، علی اکبر چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو، علی اکبر
یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو، علی اکبر ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمھیں، ہر سو علی اکبر
دل سینے میں کیوں کر تہ و بالا نہ رہے گا
جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا

منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ موئے ہم
ماں کہتی تھی مختار ہیں ، بی بی شہ عالم میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اس دم
وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار سب کی یہی مرضی ہے کہ مرجائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے ، نہ وہ پیار اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار
بے زار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا ان کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے میں کون جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے زلفیں جو الجھتی تو ، سلجھوانے کو آتے
کل تک تو مرے حالِ پریشاں پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھ کو نہ خبر تھی

مانوس سکینہ سے ہیں عباسؑ دلاور میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آکر
سر سبز رہے خلق میں نو بادۂ شبرؑ شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور
بے دولھا بنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس درد کو میں بے کس و رنجور بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور ہمراہی بیمار کسی کو نہیں منظور
دنیا سے سفر ، رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

لُو چلتی ہے خاک اُڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام جنگل میں نہ راحت ، نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح ، تو جنگل میں کہیں شام دریا کہیں حائل ، کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گذر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار تمرید فقط آپ کا ہے شربتِ دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گذر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اُتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں اُف تک نہ کروں ، بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں قربان گئی ، چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغرا

وہ بات نہیں ہوگی ، جو بے چین ہوں مادر ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر ، مری گودی میں رہیں گے علی اصغر لونڈی ہوں سکینہ کی ، نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

شہہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ میں کہہ نہیں سکتا مجھے در پیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی ، گو تم نہیں آگاہ ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نورِ بصر آنکھوں پہ لے کر تجھے چلتا تو مجھ سے بہلتی ، مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے ، اور غم سے جگر ہے مرا جلتا یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے کیا ضعف و نقاہت ہے، خدا اس کو بچائے
جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیوں کر اسے لے جاؤں سفر میں

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سیّد خوش خو اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گلِ زہرا کی جو خوش بو آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو
ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں

ماں نے کہا ہاں ہاں وہی آئے ہیں مری جاں جو کہنا ہو کہہ لو کہ یہاں اور ہے ساماں
دیکھو تو اِدھر روتے ہیں بی بی شہِ ذیشاں صغرا نے کہا ان کی محبت کے میں قرباں
وہ کون سا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کھل کر کہو مجھ سے کہ جدا ہوتے ہیں بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لئے باہر نہ فرش، نہ ہے مسندِ فرزند پیمبرؐ
دالان سے کیا ہوگیا گہوارۂ اصغر اجڑا ہوا لوگوں نظر آتا ہے مجھے گھر
کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبطِ پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

شبیرؑ کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم صغرا کے لئے رونے لگیں زینبؑ و کلثومؑ
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیّدِ مظلوم پردہ رہا اب کیا تمھیں خود ہو گیا معلوم
تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار میں پا بہ رکاب، اور ہو تم صاحبِ آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں، سفر میں جو ہو بیمار تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
غربت میں بشر کے لئے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

رخصت کرو ان کو جو کہ ہیں ملنے کو آئے کہہ دو کوئی گہوارۂ اصغر کو بھی لائے
نادان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے جانے کی خبر میری نہ صغرا کہیں پائے
ڈر ہے کہیں گھبرا کے نہ دم اس کا نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

رخصت کو ابھی قبر پیمبر پہ ہے جانا کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہوئے مرا آنا
امّاں کی لحد پر ہے ابھی اشک بہانا اس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لئے جاتی ہے ، تقدیرِ وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

سن کر یہ سخن بانوئے ناشاد پکاری میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہوگئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری یہ کس کے لئے کرتے ہیں سب گریہ وزاری
اب کس پہ میں اس صاحبِ آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں ہوں میں ، کلیجہ نہیں ، سینہ میں سنبھلتا صاحب مرے دل کو ہے کوئی ہاتھوں سے ملتا
میں تو اسے لے چلتی ، پہ کچھ بس نہیں چلتا رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دل اس کا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری پہ کھڑی ہے
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

چلاتی تھی کبرا کہ بہن آنکھیں تو کھولو کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں تم اُٹھ کے بغلگیر تو ہو لو چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رولو
تم جس کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
گھر بھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا

ہشیار ہو کیا صبح سے بیہوش ہے خواہر اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگو اُٹھ کے کھڑی روتی ہیں مادر ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اُٹھا کر
افسوس ، اسی طور سے غفلت میں رہو گی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

ان بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر بہنوں ہمیں یثرب سے لئے جاتی ہے تقدیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیرؑ
مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

امّاں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نہ جاتی فاقے بھی اگر ہوتے تو غم اس کا نہ کھاتی
بھائی کی طرف دیکھ کے شق ہوتی ہے چھاتی بے جائے ، مجھے بات کوئی بن نہیں آتی
ظاہر میں تو مابینِ لحد سوتی ہیں امّاں
میں خواب میں جب دیکھتی ہوں روتی ہیں امّاں

ہے روح پہ امّاں کی قلق کرتی ہیں زاری سر پیٹتے میں نے انہیں دیکھا کئی باری
روداد بیاں کر گئی ہیں مجھ سے وہ ساری فرماتی تھیں بھائی سے خبردار میں واری
غم خوار ہے تو اور خدا حافظِ جاں ہے
نہ باپ ہے سر پر مرے بچے کے نہ ماں ہے

یاد آتی ہے ہر دم مجھے امّاں کی مصیبت کچھ جان کی تھی فکر نہ ان کو دمِ رحلت
آہستہ یہ فرماتی تھیں باصد غم و حسرت شبیرؑ سدھارے جو سوئے وادیِ غربت
اُس دن مری تربت سے بھی منہ موڑیو زینبؑ
اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینبؑ

امّاں کی وصیت کو بجا لاؤں نہ کیوں کر گھر بھائی سے تھا بھائی نہ ہوگا تو کہاں گھر
دو بہنیں ہیں ماں جائیاں اور ایک برادر رسی سے بندھے ہاتھ کہ بلوے میں کھلے سر
جو ہووے سو ہو بھائی کے ہمراہ ہے زینبؑ
اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینبؑ

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ پکارے شہِ عادل تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل
چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقت سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

عوراتِ محلّہ چلی آتی ہیں بصد غم کہتی ہیں یہ دن رحلتِ زہراؑ سے نہیں کم
پُرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم فرش اُٹھتا ہے کیا بچھتی ہے گویا صفِ ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت ، جدا ہوتی ہے زینبؑ
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینبؑ

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیرؑ
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر مسلم کا خط آ لے تو کریں کوچ کی تدبیر
للہ ابھی قبرِ پیمبرؐ کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہؑ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

وہ گھر ہے ملک رہتے تھے جس گھر کے نگہباں کیوں اپنے بزرگوں کا مکاں کرتے ہیں ویراں
کوفے کی بھی خلقت تو نہیں صاحب ایماں بی بی یہ مدینے کی تباہی کا ہے ساماں
ایک ایک شقی دشمنِ اولادِ علیؑ ہے
شمشیرِ ستم واں سرِ حیدرؑ پہ چلی ہے

اُجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہوئے گا خالی بربادیِ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جانیں پھر آئیں کہ نہ آئیں شہِ عالی حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی
زہراؑ ہیں نہ حیدرؑ نہ پیمبر نہ حسنؑ ہیں
اب اُن کی جگہ آپ ہیں یا شاہِ زمن ہیں

گرمی کا یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ ان کو تو نہ لے جائیں سفر میں شہِ ذی جاہ
قطرہ بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا لکھا تھا اسی سن میں مسافر انہیں ہونا
کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائیں گے ، ماں ہاتھ ملے گی

روتے ہیں وہ، جو عون و محمد کے ہیں، ہم سن کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں، یہ نہیں ممکن گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرتِ شبرؑ کے سایے میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اُٹھانے کو چلے ہو

ہم جولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے، ہم جائیں نہ کیوں کر ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حقِ غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لئے لوگ چلے آتے ہیں باہم ہر قلب حزیں ہے، تو ہر اک چشم ہے پُرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم غل ہے کہ چلا دل بہ مخدومۂ عالم
خدّام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبیؐ کے
روضہ پہ اُداسی ہے رسولِ عربیؐ کے

ہے جب سے کھلا حالِ سفر بند ہے بازار یہ جنسِ غم ارزاں ہے کہ روتے ہیں دکاں دار
خاک اُڑتی ہے ویرانیِ یثرب کے ہیں آثار ہر کوچے میں ہے شور، کہ ہے ہے شہِ ابرار
اب یاں کوئی والی نہ رہا آہ ہمارا
جاتا ہے مدینے سے شہنشاہ ہمارا

تدبیر سفر میں ہیں ادھر سبط پیمبر گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباسؑ دلاور تقسیم سواری کے تردّد میں ہیں اکبر
شہ کو جنھیں لے جانا ہے، وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل، چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں، محمل بھی ہیں تیار چلاتے ہیں درباں، کوئی آئے نہ خبردار
ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لئے فراش کھڑے ہیں

مراثی

مرثیہ

میر ببر علی انیس

(۱۸۰۱ء - ۱۸۷۴ء)

فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے سادات کی بستی کے اُجڑنے کی خبر ہے
در پیش ہے وہ غم، کہ جہاں زیر و زبر ہے گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بہ سر ہے
گل رُو صفتِ غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورتِ گل دستہ کھڑے ہیں

آراستہ ہیں بہر سفر، سروِ قبا پوش عمامے سروں پر ہیں عبائیں بسر دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر

عباسؑ کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر یداللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؑ کے ہوا خواہ واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جانکاہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ اُنس، یہ خُلقِ حسنی کون کرے گا

ہمیں تو صرف
براہمن، کھشتریہ اور ویشیہ کی
سیوا کرنا تو نے لکھا تھا
چمار، بھنگی اور چانڈال کی تو نے لکھی تقدیر
گانو کے باہر رہنا اور
ٹوٹے ہوئے برتن میں کھانا
یہاں کا بھینسہ بھی پنڈت!
گدھا بھی گنگا جل پیتا ہے!!

لیکن تجھ کو ہے معلوم
اب میں نے چیل کی مانند اُڑنا سیکھ لیا ہے
شیر کی مانند جست لگانا سیکھ لیا ہے
لفظوں کو ہتھیار بنانا سیکھ لیا ہے

ایک نہ اک دن
تیری کھال ادھیڑ کے تیرے ہاتھ میں رکھ دوں گا
تو نے میرے باپ کو ننگا کر کے مارا تھا ایسے.....!!

●●●

منو[1]

جینت پرمار

(پیدائش:۱۹۵۴ء)

ایک نہ ایک دن
گھر کے آگے
نیم کی شاخ پر
ننگا کر کے
لٹکا دوں گا تجھ کو منو!
تیری رگوں کو چیر پھاڑ کر دیکھوں گا
تو نے پیا ہے کتنا لہو
میرے بزرگوں کا!

ایک نہ اک دن
تیری کھال ادھیڑ دوں گا

---

[1] منوسمرتی کا خالق

لفظوں کا پُل

ندا فاضلی

(پیدائش: ۱۹۳۸ء)

مسجد کا گنبد سُونا ہے
مندر کی گھنٹی خاموش
مجودانوں میں لپٹے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے
رنگ!
گلابی
نیلے
پیلے
کہیں نہیں ہیں
تم اُس جانب
میں اِس جانب
بیچ میں میلوں گہرا غار
لفظوں کا پُل ٹوٹ چکا ہے
تم بھی تنہا
میں بھی تنہا!

●●●

چھلنی ہوا سوئی کی نوک سے
خواہشوں کے دیئے
جسم میں بجھ گئے
سبز پانی کی سیال پر چھائیاں
لمحہ لمحہ بدن میں اُترنے لگیں
گھر کی چھت میں جڑے
دس ستاروں کے سایوں تلے
عکس دھندلا گئے
عکس مرجھا گئے!

●●●

والد کے انتقال پر

عادل منصوری

وہ چالیس راتوں سے سویا نہ تھا
وہ خوابوں کو اونٹوں پہ لادے ہوئے
رات کے ریگ زاروں میں چلتا رہا
چاندنی کی چتاؤں میں جلتا رہا
میز پر
کانچ کے اک پیالے میں رکھے ہوئے
دانت ہنستے رہے
کالی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے پھر
موتیے کی کلی سر اُٹھانے لگی
آنکھ میں تیرگی مسکرانے لگی
روح کا ہاتھ

میری دونوں آنکھیں برہنہ پڑی تھیں
وہاں تک کسی خواب کے ہاتھ پہنچے نہیں
کبوتر کی آنکھوں میں
ٹوٹے ہوئے آسمانوں کا تنزل نہ دیکھو
بدن کے شکستہ کھنڈر سے نکل بھاگنے کے لئے پھر
تمہاری مدد کی ضرورت ہے مجھ کو!

●●●

وقت کی پیٹھ پر

عادل منصوری

(۱۹۳۶ء - ۲۰۰۸ء)

وقت کی پیٹھ پر
کچے لمحوں کے دھاگوں میں لپٹا ہوا
شہر کی سیڑھیوں پر سرکتا ہوا
نت نئے خودکشی کے طریقوں کا موجد بنا
حبشی راتوں کے جنگل میں بکھری ہوئی
لمس کی ہڈیاں
چن رہا ہوں نہ جانے میں کس کے لئے
جب مرے نام کے لفظ تنہا تھے لوگو
تمہیں سرخ ہونٹوں کی خیرات
کیسے ملی یہ بتاؤ؟
ریفریجریٹر میں رکھی طشتری میں

نیا کھیل

شہریار

(پیدائش:۱۹۳۶ء)

اے اہلِ شہر آؤ چلو اس طرف چلو
تنہائیوں کی دھند سے آگے ذرا اُدھر
وہ سامنے کھلا ہوا میدان ہے جہاں
اک ایسا کھیل پیش کیا جائے گا جہاں
جو آج تک کسی نے بھی دیکھا نہیں کبھی
یعنی ، تمہاری جاگتی آنکھوں کے سامنے
آوازوں کے نجوم ، صداؤں کے ماہتاب
سناٹوں کی صلیب پہ لٹکائے جائیں گے

●●●

جس کی تقدیر میں ایک پل کا
فقط ایک پل کا اُجالا لکھا ہے
مرا جرم یہ ہے:
کہ میں اس تماشے میں لایا گیا
آخری آدمی ہوں!

●●●

میرا جرم

کُمار پاشی

دیوتاؤں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب
چندرماؤں کے آئینوں پہ گرد جم جائے گی
اور سورج سمندر کی گہرائیوں میں اُتر جائیں گے
تب ہر اک رنگ
کالک میں تبدیل ہو جائے گا
رستہ رستہ اندھیرے بکھر جائیں گے
اور تم کو ہوا بن کے چپ چاپ
اندھے سفر پر نکلنا پڑے گا
ہزاروں برس
موت کی وادیوں میں بھٹکنا پڑے گا
مرا جرم یہ ہے:
کہ میں ایسے سورج سے پیدا ہوا

جو پرانی زمینوں کے نیچے کہیں دفن ہے
کوئی آواز کانوں میں آتی نہیں ہے
میں شاید پرانی زمینوں کے نیچے بہت دور نیچے کہیں دفن ہوں
خوں میں لتھڑائے ہوئے ہاتھ
تاریک گنبد
یہ اندھی ہوا
پھڑ پھڑاتا ہوا ایک زخمی پرندہ
کہیں دور — اپنی فصیلوں کے اندر بکھرتی ہوئی
نامرادوں کی بستی کے اوپر
میں جلتے پروں سے اُڑا جا رہا ہوں
یہ آگ اور خوں کے سمندر میں گرتا ہوا شہر میرا نہیں ہے!

●●●

یہ گرتا ہوا شہر میرا نہیں

کُمار پاشی

(۱۹۳۵ء - ۱۹۹۲ء)

یہ آگ اور خوں کے سمندر میں گرتا ہوا شہر میرا نہیں
ہوا سے الجھتا ہوا میں چلا جا رہا ہوں، اندھیرا ہے گہرا، گھنا بے اماں
رات کے دشت میں تیرے، میرے مکاں
دور ہوتے چلے جا رہے ہیں
لہو کے اُجالے بھی معدوم ہیں
اور تاریک گنبد میں معصوم روحوں کے کہرام میں
بے صدا آسماں کی طرف
خوں میں لتھڑے ہوئے ہاتھ اُٹھتے ہیں، تحلیل ہو جاتے ہیں
اور کہیں دور اپنی فصیلوں کے اندر بکھرتی ہوئی
نامرادوں کی بستی کے اوپر

ہوا سے الجھتا ہوا میں اڑا جا رہا ہوں اندھیرا ہے گہرا، گھنا، بے اماں
میں بلاتا ہوں، آواز دیتا ہوں اب اس حسیں شہر کو

تخلیہ

عمیق حنفی

تم مجھے انجمنِ شعروسخن میں نہ بلاؤ
مجھ میں سو عیب کا ایک عیب ہے، رہنے دو مجھے
اپنے اس گوشۂ تنہائی میں محصور پڑا رہنے دو
بھیڑ سے عشق نہیں ہے مجھ کو
بھیڑ محبوبہ نہیں ہے میری
میں کبھی اس کے اشاروں پہ نہیں چل سکتا
گھر سے میں جب بھی نکلتا ہوں، تو کپڑوں کی طرح
جسم پر اپنے "انا" کو نہیں بدلا کرتا
میں جہاں جاتا ہوں رہتا ہے "انا" میرے ساتھ
اور سو عیب کا ایک عیب یہی ہے مجھ میں
مجھ کو کانٹوں میں نہ کھینچو، نہ ستاؤ
تم مجھے انجمنِ شعروسخن میں نہ بلاؤ!

●●●

(تاش اور شطرنج کے شاہوں سے برتر ہے کہیں
وہ پیادہ جو چلے
وہ پیادہ جو چلے خود اپنی چال)
اے مری نامستعد مجہول ذات
کوئی فکر!
کوئی کام!
کوئی بات!

●●●

میں ہی بزمِ ذات میں رونق افروز
جلوہ ہائے ذات کو دیتا ہوں داد!
جب ہوائے شوخ کی موجِ شریر
توڑ جاتی ہے کسی کھڑکی کے پردے کا جمود
تو بگڑ جاتا ہے کھیل
دیو قامت عکس کو بونا بنا دیتی ہے باہر کی کرن

اے مری نامستعد مجہول ذات
اے کہ تو از خود نظر بند آئینہ خانے میں ہے
سوچتی ہے تو کہے گی جو ہے اب تک ان کہا
اور کچھ کہتی نہیں!
سوچتی ہے تو لکھے گی شاہکار
اور کچھ لکھتی نہیں!
سوچتی ہے تو جہانداری کی بات
اور کچھ کرتی نہیں!
سوچنے ہی سوچنے میں ساعتِ تخلیق جب
تیرے شل ہاتھوں سے جاتی ہے پھسل
تو بلک پڑتی ہے تو!
اے مری نامستعد مجہول ذات
خلوتِ آئینہ خانہ سے نکل
اے چراغِ آرزو
اس طرف ضو پاش ہو
جس طرف ہے شاہراہِ جستجو

آئینہ خانے کے قیدی سے

عمیق حنفی
(۱۹۲۸ء - ۱۹۸۵ء)

ذات کا آئینہ خانہ
جس میں روشن اک چراغ آرزو
چارسو
زعفرانی روشنی کے دائرے
مختلف ہیں آئینوں کے زاویے،
ایک لیکن عکسِ ذات
اک اکائی پر اسی کی ضرب سے
کثرتِ وحدت کا پیدا ہے طلسم
خلوت آئینہ خانہ میں کہیں کوئی نہیں
صرف میں
میں ہی بت
اور میں ہی بت پرست

یہ زرد بچّے

بلراج کومل

گھروں کی رونق
یہ زرد بچّے
پڑھیں لکھیں گے، جوان ہوں گے
معاش کی فکر، ان کی قسمت
تلاشِ فردا — حیات ان کی
یہ رہ گذاروں پہ اپنے موہوم خواب لے کر پھرا کریں گے
یہ گھر بنائیں گے، شادیانے بجائیں گے، آنے والے رنگیں دنوں کی خاطر
یہ چند لقموں کو زندگی کا مآل سمجھیں گے، حسب دستور
عمر بھر ان کو انگلیوں پر گنا کریں گے
یہ میرا حصہ
یہ تیرا حصہ
پھر ایک دن
یہ بھی زرد بچوں کے باپ ہوں گے
اور ان کی خاطر دعا کریں گے
دراز ہو ان کی عمر، دیکھیں یہ سو بہاریں!

●●●

ہوا پر دستک

بلراج کومل

(پیدائش:۱۹۲۸ء)

خواب انگیز آنکھیں
دور کے مکان میں
سرِ شام
غروب ہو گئیں
اب سامنے دیوار پر
ایک برہنہ تصویر ہے
اور کمرے میں
بدنیت صدا سنسناتی ہے

باہر شہر گنجان آباد ہے
کچرے کے ڈھیروں پر
بدرنگ
عدالتی کاغذات
رقص کرتے ہیں
سیلِ ہاؤ ہو میں گھرا ہوا
طفلِ ناداں
ہوا پر دستک دیتا ہے!

●●●

تری یہ طرز عطا کس قدر انوکھی ہے
دیے نہ لعل و گوہر نہ سیم و زر بخشا
یقیں کی شمع جلائی دلوں کی دنیا میں
سیاہ راتوں کو سرمایۂ سحر بخشا
بلند و پست کا عرفاں دیا نگاہوں کو
دلوں کو جذبۂ تمیزِ خیر و شر بخشا

مگر یہ کیسے بتائیں کہ اپنے ذہنوں سے
ترے پیام کا ہر نقش دھو دیا ہم نے
بتائیں کیسے کہ تاریکیوں کے طوفاں میں
تجلیوں کا سفینہ ڈبو دیا ہم نے
بنا کے مصلحت وقت کو شعار اپنا
ترا دیا ہوا سرمایہ کھو دیا ہم نے

نثار ہوگیا محکومیت کی پھونکوں پر
دھڑکتے سینوں میں جو آتشیں شرارہ تھا
نہ جانے چھوٹ گیا کون سے مراحل میں
وہ عزم کار کہ منزل کا استعارہ تھا
ڈبو کے بیٹھ رہے آنسوؤں کے طوفاں میں
ترا سبق کہ جو اک نور کا منارہ تھا

بڑھے ہیں نار تمول کے آہنی پردے
ہماری نذر کو گلپوش بجلیاں لے کر
ہے ناخدا کا تقاضا کہ ہو سپاس گزار
لرزتی ناؤ کو منجدھار کی طرف کھے کر
سوال کرتا ہے تاریخ کا اک اک صفحہ
ہمارے ہاتھوں میں ماضی کا آئینہ دے کر

دلوں میں جذب شہ مشرقین ہے کہ نہیں؟
یزید لاکھوں ہیں، کوئی حسین ہے کہ نہیں؟

●●●

مآلِ فتنۂ باطل ہے دیر پر روشن
بلاکشوں سے شہادت تری یہ کہتی ہے
اسی کا حصہ ہے پنہائے قلزم آفاق
تلاطموں کے تھپیڑے جو ناؤ سہتی ہے
دوام، کذب کی خوش رنگیوں نے کب پایا
یہ حق ہے، فتح صداقت کی ہو کے رہتی ہے

جبینِ دہر پہ خورشید و ماہ کی صورت
ترے لہو کی اک اک بوند جگمگاتی ہے
اجل کو ایک تبسم سے جیتنے والے!
حیات اپنا نگہباں تجھے بناتی ہے
تھی تری روح میں پنہاں وہ جرأت بے باک
جو حق کے نام پر شعلوں میں کود جاتی ہے

ادھر تھے تشنہ لبی کے بھنور میں کام و دہن
کڑکتے نیزوں کی ہر دھار جن پہ ہنستی تھی
جلو میں اپنے لئے سیلِ آہن و فولاد
اُدھر طلسمِ حکومت کی چیرہ دستی تھی
مچل رہی تھیں ادھر بجلیاں سنانوں میں
ادھر فقط تری مظلوم حق پرستی تھی

رہِ وفا کے خم و پیچ دیں جسے آواز
وہ گھر سے باندھ کے سر سے کفن نکلتا ہے
عجیب چیز ہے مومن کا فقرِ بے پروا
غرور سطوت و حشمت کا دل دہلتا ہے
ترے ثبات نے دنیا پہ کر دیا روشن
ہوا کی زد پہ یقیں کا چراغ جلتا ہے

حسین

سیّد حرمت الاکرام

(۱۹۲۸ء - ۱۹۸۳ء)

حسین! تیری زمانہ ستیز فطرت نے
جہاں میں عظمت انساں کو سر بلند کیا
کر اہتی ہوئی انسانیت کے سینے کو
صداقتوں کی امانت سے بہرہ مند کیا
ترے وجود نے اپنے لہو کی چھینٹوں سے
ستم نصیب حقائق کو ارجمند کیا
ہزار جور و تحکم نے کی صف آرائی
ہٹا نہ رہ گزر شوق سے قدم تیرا
سلگتے لمحوں کے حشر آفریں تلاطم میں
بلند اور ہوا تفتہ جاں علم تیرا
الٹنے لگتا ہے اوراق اک صحیفۂ نور
رواں لبوں پہ جو پاتے ہیں نام ہم تیرا

گھر سے باہر ہوا تیز تھی
اور یہ بھڑکتی رہی
اور ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں اپنے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے!

●●●

میں گوتم نہیں ہوں

خلیل الرحمٰن اعظمی
(۱۹۲۷ء - ۱۹۷۸ء)

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو
ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی
کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی

آج بھی ایسا ہی ہوگا

محمد علوی

صبح ہوئی
اور چڑیاں گھر میں آنے لگیں
طوطوں کی ڈاریں کی ڈار بھی
شہر سے باہر جانے لگیں
رکشوں اور بسوں کو لے کر
رستے بھاگ پڑے
ہم نے اپنے خواب سمیٹے
ہم بھی جاگ پڑے
اب سارا دن
اک جیسے کاموں میں گذرے گا
اور پھر سورج ڈوبے گا
اور پھر
صبح سویرے اُبھرے گا
روز ایسا ہوتا رہتا ہے
آج بھی ایسا ہی ہوگا!

●●●

مگر نہ جانے
وہ دن کہاں ہے
وہ آخری دن
کہ جب خدا یہ تمام چیزیں سمیٹ لے گا
مجھے اسی دن کی جستجو ہے
کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں!

●●●

ندیوں کی لکیریں کھینچیں
سمندروں کو
زمیں کی آغوش میں بٹھایا
پہاڑ رکھے
درخت اُگائے
درخت پہ
پھول، پھل لگائے
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
یہ دن بنایا
کہ دن میں کچھ کام کر سکو تم
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
یہ شب بنائی
کہ شب میں آرام کر سکو تم
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
یہ سب بنایا
مگر یہ نہ بھولو
کہ ایک دن میں
یہ ساری چیزیں سمیٹ لوں گا
خدا نے جو کچھ کہا ہے
سچ ہے

آخری دن کی تلاش

محمّد علوی

خدا نے قرآن میں کہا ہے
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
فلک بنایا
فلک کو تاروں سے
چاند، سورج سے جگمگایا
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
زمیں بنائی
زمیں کے سینے پہ

خالی مکاں

محمد علوی

جالے تنے ہوئے ہیں ، گھر میں کوئی نہیں
"کوئی نہیں" اک اک کونا چلاتا ہے
دیواریں اُٹھ کر کہتی ہیں "کوئی نہیں"
"کوئی نہیں" دروازہ شور مچاتا ہے
کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں لیکن
کوئی مجھے اس گھر میں روز بلاتا ہے
روز یہاں میں آتا ہوں ہر روز کوئی
میرے کان میں چپکے سے کہہ جاتا ہے
"کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں پگلے
کس سے ملنے روز یہاں تو آتا ہے"

●●●

میں مطمئن تھا
لیکن بہت جلد
یہ اطمینان بھی مجھ سے چھین لیا گیا
ہوا یوں
کہ ابھی میں
پوری طرح مٹی بھی نہ ہوا تھا
کہ ایک اور شخص
میری قبر میں گھس آیا
اور اب
میری قبر پر
کسی اور کا
کتبہ نصب ہے!

●●●

9

کتبہ

محمد علوی

(پیدائش: ۱۹۲۷ء)

قبر میں اُترتے ہی
میں آرام سے دراز ہو گیا
اور سوچا
یہاں مجھے
کوئی خلل نہیں پہنچائے گا
یہ دو گز زمین
میری
اور صرف میری ملکیت ہے
اور میں مزے سے
مٹی میں گھلتا ملتا رہا
وقت کا احساس
یہاں آ کر ختم ہو گیا

تم جو آؤ تو اُجالے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی لذتِ انجام لئے
جب تمنائیں کسی خون سے چیخ اُٹھتی ہیں
اور خاموشیِ لب سکیڑوں ابہام لئے
ایک سنگین حقیقت میں بدل جاتی ہیں
زندگی درد میں ڈھل جاتی ہے

●●●

بازدید

مُنیب الرحمٰن

(پیدائش:۱۹۲۳ء)

تم جو آؤ تو دھندلکے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی کیفِ سرِ شام لئے
جب لرزتے ہیں صداؤں کے سمٹتے سائے
اور آنکھیں خلشِ حسرت ناکام لئے
ہر گزرتے ہوئے لمحے کو تکا کرتی ہیں
خود فریبی سے ہم آغوش رہا کرتی ہیں

تم جو آؤ تو اندھیرے میں لپٹ کر آؤ
مستی بادِ سبک گام لئے
شبنمی شیشوں کو سہلائیں لچکتی شاخیں
اور مہتاب زمستاں کوئی پیغام لئے
یوں چلا آئے کہ در باز نہ ہو
کوئی آواز نہ ہو

سوچا نہ تھا کہ آئے گا یہ دن بھی پھر کبھی
اک بار پھر ملے ہیں ذرا مسکرا تو لیں!
کیا جانے اب نہ اُلفتِ دیرینہ یاد آئے
اس حسنِ اختیار پہ آنکھیں جھکا تو لیں
برسا لبوں سے پھول ، تری عمر ہو دراز
سنبھلے ہوئے تو ہیں پہ ذرا ڈگمگا تو لیں

اور اپنا اپنا عہدِ وفا بھول جائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

برسوں کی بات ہے کہ مرے جی میں آئی تھی
میں سوچتا تھا تجھ سے کہوں ، چھوڑ کیا کہوں!
اب کون ان شکستہ مزاروں کی بات لائے
ماضی پہ اپنے حال کو ترجیح کیوں نہ دوں!
ماتم خزاں کا ہو کہ بہاروں کا ، ایک ہے
شاید نہ پھر ملے تری آنکھوں کا یہ فسوں!

جو شمعِ انتظار جلی تھی بجھائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

●●●

آخری ملاقات

اختر الایمان

آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

آتی نہیں کہیں سے دلِ زندہ کی صدا
سونے پڑے ہیں کوچہ و بازار عشق کے
ہے شمعِ انجمن کا نیا حسنِ جاں گداز
شاید نہیں رہے وہ پتنگوں کے ولولے
تازہ نہ رہ سکیں گی روایاتِ دشت و در
وہ فتنہ سر گئے جنھیں کانٹے عزیز تھے

اب کچھ نہیں تو نیند سے آنکھیں جلائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم

آچکے صاحبِ افلاک کے پیغام و سلام
کوہ و دراب نہ سنیں گے وہ صدائے جبریل
اب کسی کعبہ کی شاید نہ پڑے گی بنیاد
کھو گئی دشتِ فراموشی میں آواز خلیل

چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے
ڈال دیتے ہیں ستارے دُھلی چادر اپنی
اس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے ، پہ بس اک
چشمِ نم کرتی ہے شبنم یہاں اکثر اپنی

ایک میلا سا ، اکیلا سا ، فسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھایا بھی کرو؟
ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے!

تیز ندی کی ہر ایک موجِ تلاطم بردوش
چیخ اُٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی!
کل بہا لوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی!

●●●

اور جاتے ہوئے سورج کی وداعی انفاس
روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں

حسرتِ شام و سحر بیٹھ کے گنبد کے قریب
ان پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہیں رنگِ اثر کی خاطر
اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے!

یا ابابیل کوئی آمد سرما کے قریب
اس کو مسکن کے لئے ڈھونڈ لیا کرتی ہے
اور محرابِ شکستہ میں سمٹ کر پہروں
داستاں سرد ممالک کی کہا کرتی ہے

ایک بوڑھا گدھا دیوار کے سائے میں کبھی
اونگھ لیتا ہے ذرا بیٹھ کے جاتے جاتے
یا مسافر کوئی آجاتا ہے ، وہ بھی ڈر کر
ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہے آتے آتے!

فرش جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں
واقفِ قطرۂ شبنم بھی نہیں ہے حتا م
طاق میں شمع کے آنسو ہیں ابھی تک باقی
اب مصلے ہے نہ منبر ، نہ مؤذن نہ امام

مسجد

اختر الایمان

دور ، برگد کی گھنی چھاؤں میں ، خاموش و ملول
جس جگہ رات کے تاریک کفن کے نیچے
ماضی و حال گنہگار نمازی کی طرح
اپنے اعمال پہ رو لیتے ہیں چپکے چپکے

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کوئی
مرثیہ عظمتِ رفتہ کا پڑھا کرتا ہے

گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہ میں دبا جاتے ہیں

مرجھا جاتے ہیں اکثر کیوں؟ کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے رُوحِ ارض کو آخر؟ اور یہ زہریلے افکار
کس مٹی سے اُگتے ہیں سب ، جینا کیوں ہے اک بیگار
ان باتوں سے قطع نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

دور کہیں وہ کوئل کوکی ، رات کے سناٹے میں دور
کچی زمیں پر بکھرا ہوگا ، مہکا مہکا آم کا بُور
بارِ مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چور
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے لو دیکھو وہ صبح کا نور
چاہِ شب سے پھوٹ کے نکلا میں مغموم کبھی مسرور
سوچ رہا ہوں اِدھر اُدھر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

نیند سے اب بھی دور ہیں آنکھیں گو کہ رہیں شب بھر بے خواب
یادوں کے بے معنی دفتر ، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو گزری بات ہے نقش برآب
مستقبل کی سوچ ، اُٹھا یہ ماضی کی پارینہ کتاب
منزل ہے یہ ہوش و خبر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

●●●

کہیں کوئی ناسور نہیں ، گو حائل ہے برسوں کا فراق
کرم فراموشی نے دیکھو چاٹ لئے کتنے میثاق
وہ بھی ہم کو رو بیٹھے ہیں ، چلو ہوا قرضہ بیباق
کھلی تو آخر بات اثر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

خواب تھے اک دن اوجِ زمیں سے کاہکشاں کو چھو لیں گے
کھیلیں گے گل رنگ شفق سے قوسِ قزح میں جھولیں گے
بادِ بہاری بن کے چلیں گے سرسوں بن کر پھولیں گے
خوشیوں کے رنگیں جھرمٹ میں رنج و محن سب بھولیں گے
داغِ گل و غنچہ کے بدلے مہکی ہوئی خوشبو لیں گے
ملی خلش پر زخمِ جگر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

خوار ہوئے دمڑی کے پیچھے اور کبھی جھولی بھر مال
ایسے چھوڑ کے اُٹھے جیسے چھوا تو کردے گا کنگال
سیانے بن کر بات بگاڑی ، ٹھیک پڑی سادہ سی چال
چھانا دشتِ محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر ، کبھی قلندر ، کبھی بگولہ ، کبھی خیال
سوانگ رچائے اور گزر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

زیست خدا جانے ہے کیا شئے بھوک تجسس ، اشک فرار
پھول سے بچے زہرہ جبینیں مرد مجسم ، باغ و بہار

نافہ مشک تاری بن کر لئے پھری مجھ کو ہر سو
یہی حیاتِ صاعقہ فطرت بنی تعطل کبھی نمو
کبھی کیا رم عشق سے ایسے جیسے کوئی وحشی آہو
اور کبھی مر مر کے سحر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

کبھی غنیم جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
ارضِ الم میں خوار ہوئے ہم ، بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا تو بیت گئے جگ ہوئی نہ رات
ہر سو مہوش سا وہ قاتل لطف و عنایت کی سوغات
شبنم ایسی ٹھنڈی نگاہیں پھولوں کی مہکار سی بات
جوں توں یہ منزل بھی سر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

راہ نوردِ شوق کو رہ میں کیسے کیسے یار ملے
ابرِ بہاراں عکس نگاراں خالِ رُخِ دلدار ملے
کچھ بالکل مٹی کے مادھو ، کچھ خنجر کی دھار ملے
کچھ منجدھار میں کچھ ساحل پر کچھ دریا کے پار ملے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یونہی ہاتھ پسار ملے
صرف ان کی خوبی پہ نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

ساری ہے بے ربط کہانی دھندلے دھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب جن سے جب تھی پل بھر کی دوری بھی شاق

وہ اک بالک جس کو گھر سے اک درہم بھی نہیں ملا
میلے کی سج دھج میں کھو کر باپ کی اُنگلی چھوڑ گیا
ہوش آیا تو خود کو تنہا پا کے بہت حیران ہوا
بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

وہ بالک ہے آج بھی حیراں ، میلا جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت ، کہیں بت ، کہیں محبت ، کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے ، کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

ہونٹ تبسم کے عادی ہیں ، ورنہ روح میں زہر آگیں
گھپے ہوئے ہیں اتنے نشتر جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جس پر ناز ہے ہم کو اتنا جھکی ہے اکثر وہی جبیں
کبھی کوئی سفلہ ہے آقا کبھی کوئی ابلہ فرزیں
بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

کالے کوس غمِ الفت کے اور میں نان شبینہ جو
کبھی چمن زاروں میں الجھا اور کبھی گندم کی بُو

یادیں

اختر الایمان

لو وہ چاہِ شب سے نکلا پچھلے پہر پیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رکتے رکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر ، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو ، گزری بات ہے نقش برآب
یہ رُوداد ہے اپنے سفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!

شہرِ تمنا کے مرکز میں لگا ہوا ہے میلا سا
کھیل کھلونوں کا ہر سو ہے اک رنگین گلزار کھلا

جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے ، دیکھو میں زندہ ہوں!

●●●

اسی نے خسروی دی ہے لیموں کو ، مجھے نکبت
اسی نے یا وہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضے میں
جزاک ذہن رسا کچھ بھی نہیں ، پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اُٹھانا ہے
عناصر منتشر ہوجانے ، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے

وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکّے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جاتا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح ، لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلّا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج ، اندوہ پرور ، اضطراب آسا

ہوا میں تیرتا ، خوابوں میں بادل کی طرح اُڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا ، مڑتا
مجھے اک لڑکا آوارہ منش ، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا ، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے یوں لگتا ہے ، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے ، ہر گام پر ، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں ، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کررہا ہے ، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

خدائے عز و جل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بسترِ کم خواب ہو ، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایہ
اسی کی بخششیں ہیں ، اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا ، اک حدِ فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاک اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے ، کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کردی ہیں
وہ حاکم قادر مطلق ہے ، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اُجالے سے جدا کرتا ہے ، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے!

ایک لڑکا

اختر الایمان

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم چھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم، تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی کم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ سا، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ

نہ مرنے والا آدمی

اختر الایمان

(۱۹۱۵ء - ۱۹۹۶ء)

یہ مٹی بوئے خوں آتی ہے جس کے لالۂ و گل سے
یہی میری زمیں ہے ، میرا مولد ، میرا مدفن ہے
میں وہ قابیل ہوں جو لاش کاندھے پر لئے پھرتا ہے بھائی کی
ثمود و عاد کا وہ فرد ہوں جس پر فلک نے سنگ باری کی
میں وہ تاریخ کا پہلا ورق ہوں دست برد و جہدِ عالم سے
اچانک بچ گیا ، سب کچھ رقم ہے ایک صفحے پر
میں لاشوں پر چلا ہوں ، خون کے دریا سے گذرا ہوں
مرا ورثہ ہے آنسو ، بے کسی کی موت ، بالا دست کا نشتر
میں نوحہ خواں ہوں ، آبائی مزاروں کا مجاور ہوں

●●●

ذخّار سمندر سوکھے ہیں، پُر ہول چٹانیں پگھلی ہیں
دھرتی نے ٹوٹتے تاروں کی جلتی ہوئی لاشیں نگلی ہیں
پہنائے زماں کے سینے پر اک موج انگڑائی لیتی ہے
اس آب و گِل کی دلدل میں اک چاپ سنائی دیتی ہے
اک تھرکن سی، اک دھڑکن سی، آفاق کی ڈھلوانوں میں کہیں
تانیں جو ہمک کر ملتی ہیں، چل پڑتی ہیں، رکتی ہی نہیں
ان راگنیوں کے بھنور بھنور میں صدہا مہرباں گھوم گئیں
اس قرن آلود مسافت میں لاکھ آبلے پھوٹے، دیپ بجھے
اور آج کسے معلوم ضمیرِ ہستی کا آہنگِ تپاں
کس دور کے دیس کے کہروں میں لرزاں لرزاں، رقصاں رقصاں
اس سانس کی رو تک پہنچا ہے
اس میرے میز پہ جلتی ہوئی قندیل کی لَو تک پہنچا ہے
کون آیا ہے! کون آتا ہے! کون آئے گا؟
ان جانے من کی مورکھتا کو کیا کیا دھیان گذرتا ہے
دل ڈرتا ہے
دل ڈرتا ہے ——— ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے!

●●●

راتوں کو

مجید امجد

آنکھوں میں کوئی بس جاتا ہے
میٹھی سی ہنسی ہنس جاتا ہے
احساس کی لہریں ان تاریک جزیروں سے ٹکراتی ہیں
جہاں ننھے پنکھ سنوارتے ہیں
سنگین فصیلوں کے گنبد سے پہرے دار پکارتے ہیں
"کیا کرتا ہے
دل ڈرتا ہے
دل ڈرتا ہے —— ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے

ان سونی تنہا راتوں میں
دل ڈوب کے گذری باتوں میں
جب سوچتا ہے، کیا دیکھتا ہے ہر سمت دھوئیں کا بادل ہے
وادی و بیاباں جل تھل ہے

توسیع شہر

مجید امجد

(۱۹۱۴ء - ۱۹۷۴ء)

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے سہانے ، چھانو چھڑکتے ، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر اک جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان سادھوؤں کے جسم
گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے پہیکل ، جھڑتے پنجر ، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ ٹہلتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک اے آدم کی آل!

☆☆☆☆

ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

●●●

سرسبز ، ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا ، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رُخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہ رو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایّام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے

خوں کی گردش ، دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت ، میری زمیں
اس کی صبحیں ، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے ، بے سمجھے ہوئے
اک مشتِ غبارِ انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اُٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی اُنگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی ، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

میرا سفر

علی سردار جعفری

(۱۹۱۳ء - ۲۰۰۰ء)

"ہچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم"
(رومیؔ)

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی

جو بات ہو دل کی، آنکھوں کی،
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو،
جتنی بھی جہاں ہو جلوہ گری اس سے دل کو گرمانے دو—
جب تک ہے زمیں
جب تک ہے زماں
یہ حسن و نمائش جاری ہے!
اس ایک جھلک کو چھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو

ہم اس دنیا کے مسافر ہیں
اور قافلہ ہے ہر آن رواں،
ہر بستی، ہر جنگل، صحرا اور روپ منوہر پربت کا
اک لمحہ من کو لبھائے گا، اک لمحہ نظر میں آئے گا،

ہر منظر، ہر انساں کی دیا، اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے، پل بیتا سب مٹ جائے گا،
اس ایک جھلک کو چھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو،
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو؟
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی؟

ہے چاند فلک پر اک لمحہ،
اور اک لمحہ یہ ستارے ہیں،
اور عمر کا عرصہ بھی، سوچو اک لمحہ ہے!

●●●

چل چلاؤ

میراجی

بس دیکھا اور پھر بھول گئے،
جب حسن نگاہوں میں آیا
من ساگر میں طوفان اُٹھا
طوفان کو چنچل دیکھ ڈری — آکاش کی گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا تارے سوئے، طوفان مٹا، ہر بات گئی،
دل بھول گیا پہلی پوجا، من مندر کی مورت ٹوٹی
دن لایا باتیں انجانی، پھر دن بھی نیا اور رات نئی
پیتم بھی نئی، پریمی بھی نیا، سکھ سیج نئی ہر بات نئی،
اک پل کو آئی نگاہوں میں جھلمل جھلمل کرتی، پہلی،
سندرتا اور پھر بھول گئے،
مت جانو ہمیں تم ہرجائی
ہرجائی کیوں، کیسے؟ کیسے؟
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی؟

اب آنکھوں میں جنبش، نہ چہرے پہ کوئی تبسم، نہ تیوری
فقط کان سنتے چلے جا رہے ہیں
یہ اک گلستاں ہے، ہوا لہلہاتی ہے، کلیاں چٹکتی ہیں، غنچے مہکتے ہیں
اور پھول کھلتے ہیں، کھل کھل کے مرجھا کے گرتے ہیں، اک فرشِ مخمل
بناتے ہیں جس پہ مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں
کہ جیسے گلستاں بھی اک آئینہ ہے
اسی آئینے میں ہر ایک شکل نکھری، سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی پھر نہ اُبھری

یہ پربت ہے خاموش ساکن
کبھی کوئی چشمہ اُبلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اس پار کیا ہے
مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے.....دامن میں وادی ہے
وادی میں ندی ہے، ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئینہ ہے،
اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری، مگر ایک پل میں جو مٹنے لگی ہے تو وہ پھر نہ اُبھری

یہ صحرا ہے.....پھیلا ہوا خشک، بے برگ صحرا
بگولے یہاں تند بھوتوں کا عکسِ مجسم بنے ہیں
مگر میں تو دور.....ایک پیڑوں کے جھرمٹ پہ اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں

نہ اب کوئی صحرا، نہ پربت نہ کوئی گلستاں
اب آنکھوں میں جنبش، نہ چہرے پہ کوئی تبسم، نہ تیوری
فقط اک انوکھی صدا کہہ رہی ہے کہ تم کو بلاتے بلاتے مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے، نہ شاید تھکے گا
تو پھر یہ صدا آئینہ ہے.....فقط میں تھکا ہوں کسی کو بلاتے بلاتے! ●●●

سمندر کا بلاوا

میراجی

(۱۹۱۲ء - ۱۹۴۹ء)

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو
بلاتے بلاتے مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کہیں ایک پل کو، کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی صدا آ رہی ہے،
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا
مرے پیارے بچے..... مجھے تم سے کتنی محبت ہے — "دیکھو اگر یوں کیا تو مجھ سے بڑھ کر
بھی کوئی نہ ہوگا....." — "خدایا خدایا"

کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری،
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیاتِ دو روزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی صدا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیے جا رہی ہے

ریشم و اطلس و کم خواب میں بنوائے ہوئے
جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں ، وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

●●●

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

فیض احمد فیضؔ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
انگنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

آج بازار میں پابجولاں چلو

فیض احمد فیضؔ

چشمِ نم ، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تُہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو ، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی ، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی ، سنگِ دشنام بھی
صبح ناشاد بھی ، روز ناکام بھی

اس کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

●●●

اب کیوں اُس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے درگزر رو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے

گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا!

●●●

تم اپنی کرنی کر گزرو

فیض احمد فیضؔ

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے

یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے
سو بار لٹے اور بھر پایا

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اُٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

●●●

جو ہاتھ بڑھے ، یاور ہے یہاں
جو آنکھ اُٹھے ، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ ، مگر

کب لُوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رَن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

اس مال کی دھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت ، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر ، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر ، شیشے ، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں ، تو فقط
چبھتے ہیں ، لہو رُلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چُن چُن کر!
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ اُدھیڑا ، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کار گہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر ، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہوسکتے ہیں

صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری ، دفتر ، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چوکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

فیض احمد فیضؔ

موتی ہو کہ شیشہ ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا ، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا ، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

●●●

نثار میں تیری گلیوں کے.....

فیض احمد فیضؔ

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لئے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لئے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

اِنتباہ

فیض احمد فیض

(۱۹۱۱ء - ۱۹۸۴ء)

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کر آہن گر کی دکاں میں
تیز ہیں شعلے ، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

●●●

نہ کوئی عکس معتبر

ہزار چہرہ آدمی

ہزار چہرگی لئے

بھٹک رہا ہے بے ارادہ صرف اسی تلاش میں

کہ اس کو.....

چہرہ چاہیے

خود اپنا چہرہ چاہیے

وہ اصلی چہرہ چاہیے

بچھڑ کے جو سسک رہا ہے چہروں ہی کی بھیڑ میں!

●●●

یہ پارہ پارہ آدمی
یہ ریزہ ریزہ آدمی
ہزار چہرہ آدمی
معاشیاتِ حرص کا اُبلتا خلفشار ہے
مجسم انتشار ہے
نظامِ بے مہار کا عظیم شاہکار ہے
ہزار چہرہ آدمی
خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا
رواں دواں
ابھی یہاں
ابھی وہاں
نہ کوئی سمت ذہن میں
نہ کوئی راہ سامنے
فقط فریب کاریٔ انا کی گرد اوڑھ کر
کبھی ہے دوڑتا اِدھر
کبھی ہے بھاگتا اُدھر
ہو کون اس کا ہم سفر؟
خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ کھو گیا
دوبارہ وہ ملے گا کیا؟
تعاونِ آئینہ کا بھی فریب ہی فریب ہے
نظر لگائے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہے
خود اپنے چہروں کا ہجوم ورطۂ نگاہ ہے!
نہ کوئی نقش منفرد

بے چہرگی

پرویز شاہدی

(۱۹۱۰ء - ۱۹۶۸ء)

ہزار پوست استخواں
ہزار لب فسردگی
ہزار پردہ تشنگی
ہزار حیلہ بے دلی
ہزار عشوہ خودسری
ہزار غمزہ عاجزی
ہزار پیچ آگہی
ہزار عقدہ الٰہی
ہزار لہجہ خامشی
ہزار مرگ زندگی
غرور برتری کے ساتھ اختلاج کم تری!

رقص گہہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگ ریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے
ایک خونیں بھیڑیے سے کم نہیں

اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا بھی پھر امکاں نہیں
تو مری اُن آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
عہدِ پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگِ ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں!
اس لئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

●●●

رقص

ن - م - راشد

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈھ لے مجھ کو، نشاں پا لے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں

سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گذر جانے پر
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انھیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے!

●●●

صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت — اُداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں!
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں

ایک بوڑھا سا، تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہسوار

دریچے کے قریب

ن - م - راشد

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
تجملِ خواب کے اس فرشِ طرب ناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے!

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مئے رنگ، جنوں خیز آنکھیں!
اسی مینار کو دیکھ

آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو!
بوے مے میں بوے خوں الجھی ہوئی
وہ ابھی تک خواب کہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزم آخری
جی میں آتا ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کو و بام کو!
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوش زمیں ہو جائے گی!

●●●

خودکشی

ن - م - راشد

کر چکا ہوں آج عزم آخری
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے، رہگذاروں سے لپٹتے، سوگوار
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا

میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و پرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر

گواہ کس عدل بے بہا کے تھے عہدِ تاتار کے خرابے؟
عجم، وہ مرزِ طلسم و رنگ و خیال و نغمہ
عرب، وہ اقلیم شیر و شہد و شراب و خرما
فقط نوا سنج تھے در و بام کے زیاں کے،
جو ان پہ گزری تھی
اس سے بدتر دنوں کے ہم صید ناتواں ہیں!

کوئی یہ کس سے کہے
در و بام،
آہن و چوب و سنگ و سیماں کے
حسن پیوند کا فسوں تھے
بکھر گیا وہ فسوں تو کیا غم؟
اور ایسے پیوند سے اُمیدِ وفا کسے تھی؟

شکستِ مینا و جام برحق،
شکست رنگ عذار محبوب بھی گوارا
مگر — یہاں تو کھنڈر دلوں کے
(— یہ نوعِ انساں کی
کہکشاں سے بلند و برتر طلب کے اجڑے ہوئے مدائن —)
شکستِ آہنگ حرف و معنی کے نوحہ گر ہیں!

●●●

نمرود کی خدائی

ن - م - راشد

(۱۹۱۰ء - ۱۹۸۰ء)

یہ قدسیوں کی زمیں
جہاں فلسفی نے دیکھا تھا، اپنے خواب سحر گہی میں
ہوائے تازہ و کشتِ شاداب و چشمۂ جانفزوں کی آرزو کا پرتو!
یہیں مسافر پہنچ کے اب سوچنے لگا ہے
وہ خواب کابوس تو نہیں تھا؟
وہ خواب کابوس تو نہیں تھا؟

اے فلسفہ گو،
کہاں وہ رویائے آسمانی؟
کہاں یہ نمرود کی خدائی
تو جال بنتا رہا ہے، جن کے شکستہ تاروں سے اپنے موہوم فلسفے کے
ہم اس یقین سے، ہم اس عمل سے، ہم اس محبت سے
آج مایوس ہو چکے ہیں!
کوئی یہ کس سے کہے کہ آخر

اُن کی آنکھوں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ یہ دھن سے دھما کا ہو جائیں
سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی اُمنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا!

●●●

قید

مخدوم محی الدّین

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لَو
جاگ اُٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہ راہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
اُن کے مصروف قدم
اُن کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش

جب مہک اُٹھتے تو دنیا کا مہک اُٹھتا تھا دل
وانگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دل

آپ میں اک گرمیٔ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہوگئی
چاندنی سی میرے دل کے پاس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہوگئی!

●●●

سب کا خواب

مخدوم محی الدّین

(۱۹۰۸ء - ۱۹۶۹ء)

وہ شبِ مئے، وہ شبِ مہتاب، میری ہی نہ تھی
وہ تو سب کا خواب تھا
وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا، میرا ہی نہ تھا
وہ تو سب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے
میرے دل میں ہی نہ تھے
وہ تو سب کا خواب تھا
لاکھ دل ہوتے تھے لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مچلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب اُچھلتے تھے تو اک دل کی طرح

گلبانگِ قفس

اختر شیرانی

(۱۹۰۵ء - ۱۹۴۸ء)

مدت سے نہ آئی کوئی خبر ، یارانِ گلستاں کیسے ہیں
اے بادِ صبا ، اتنا تو بتا ، سرو و گل و ریحاں کیسے ہیں؟
پابندِ قفس تو کیسے کہیں اور کس سے کہیں رودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں ، اربابِ گلستاں کیسے ہیں؟
ہر ایک قدم یاں مجلسِ غم ، ہر تازہ ستم اک مصرِ الم
اس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم، غم دیدۂ کنعاں کیسے ہیں؟
ہم درد ہے اپنا کون یہاں ، لا تو ہی خبر اے بادِ خزاں
اس سال وطن کے باغوں میں گلہائے بہاراں کیسے ہیں؟
غربت ہی نہ تھی کم ہوش رُبا ، اس پر یہ اسیری رنج فزا
ہے کون جو پوچھے آ کے ذرا ، ہم خستۂ حرماں کیسے ہیں؟
صیاد نے ہے چمن چمن کے کیا ، بے جرم و خطا ، محبوسِ بلا
ہے کس کو غرض جو پوچھے ذرا ، آباد یہ زنداں کیسے ہیں؟

●●●

شکست زنداں کا خواب

جوش ملیح آبادی

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مار سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

●●●

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں؟
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے، اسپ تازی کیا شفاخانے میں ہے؟
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کیا طبیعت کچھ نصیب دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اُکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے؟
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین
خیر، اے سوداگرو، اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

●●●

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمھیں جلیان والا باغ بھی؟
پوچھ لو اُس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے؟
''ڈائر'' گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے!
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اُس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
اہل آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا
آج کشتی امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درس حق دیتے ہو کیوں؟
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
''بینکی'' اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں ، اہل باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال اُن قوموں کے جو کمزور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، اب کس لئے کہتے نہیں؟
کیا کہا ''انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟

ہندیوں کے جسم میں کیا رُوحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی ، تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم ، کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے ، جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے؟
یاد تو ہوگی وہ مٹیابرج کی بھی داستاں
اب بھی جس کی خاک سے اُٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے 'ہائے اختر' کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

جوش ملیح آبادی

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
"دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو"
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا"
"بھیڑیئے کو مار دو گولی پئے امن و بقا"
"باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں"
"آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں"
"ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر"
"تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

دیدنی ہے آج

جوش ملیح آبادی

(۱۸۹۴ء - ۱۹۵۸ء)

پہلو میں تابِ حسن جواں دیدنی ہے آج
نور چراغِ خلوتیاں دیدنی ہے آج
کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لے کے ساتھ
موجِ خرام آبِ رواں دیدنی ہے آج
دم سازِ ابرو باد ہے رندانہ بانکپن
طرفِ کلاہ پیرِ مغاں دیدنی ہے آج
آرائشوں کی فکر نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگی لالہ رخاں دیدنی ہے آج
حسن جواں ، شرابِ کہن ، سازِ برشگال
عشرت سرائے بادہ کشاں دیدنی ہے آج

●●●

جو اس طرح ہوا دنیا میں آبرو کا زوال
تو کام آئے گا عقبیٰ میں کیا یہ دولت و مال
کرو خدا کے لئے کچھ مرے ہوؤں کا خیال
نہ ہوں تمہارے بزرگوں کی ہڈیاں پامال
یہ آبرو تو ہزاروں برس میں پائی ہے
نہ یوں لٹاؤ کہ رشیوں کی یہ کمائی ہے
لٹاؤ نام پہ دولت اگر ہو غیرت دار
پکار اُٹھے یہ زمانہ کہ ہے یہ پرا پکار
ہے زورِ ہمتِ مردانہ قوم کو درکار
ورق اُلٹ دو زمانے کا مل کے سب اک بار
اگر ہو مرد نہ یوں عمر رائیگاں کاٹو
غریب قوم کے پیروں کی بیڑیاں کاٹو
یہ کارِ خیر وہ ہو، نام چار سو رہ جائے
تمہاری بات زمانے کے روبرو رہ جائے
جو غیر ہیں انھیں ہنسنے کی آرزو رہ جائے
غریب قوم کی دنیا میں آبرو رہ جائے
ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو
فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھر دو
یہاں سے جائیں تو جائیں یہ جھولیاں بھر کر
لٹائیں علم کی دولت تمہارے بچوں پر
ادھر یہ ناز ہو تم کو کہ خوش گئے یہ بشر
جو ہوسکا وہ کیا نذر ان کی ٹیک کے سر
یہی ہو فخر جوانوں کا اور پیروں کا
سوال رد نہ کیا قوم کے فقیروں کا

●●●

مسز بسنٹ کے احسان کی تمھیں ہے خبر
کیا نثار بڑھاپا تمہارے بچوں پر
شریک وہ بھی ہیں اس کارِخیر کے اندر
نہ اُن کی آنکھ ہو نیچی رہے یہ مدِّ نظر
مٹے نہ بات کہیں تم پہ مٹنے والوں کی
تمہارے ہاتھ ہے شرم ان سفید بالوں کی

تمہارے واسطے لازم ہے مالوی کا بھی پاس
کہ جس کی ذات سے انکی ہوئی ہے قوم کی آس
لیا غریب نے گھر بار چھوڑ کر بن باس
جو یہ نہیں ہے تو کہتے ہیں پھر کسے سنیاس
تمام عمر کٹی ایک ہی قرینے پر
گرایا اپنا لہو قوم کے پسینے پر

اسی کے ہاتھ میں ہے قوم کا سنور جانا
تمہاری ڈوبتی کشتی کا پھر اُبھر جانا
جو تم نے اب بھی نہ دنیا میں کام کر جانا
تو یہ سمجھ لو کہ بہتر ہے اس سے مر جانا
غضب ہوا جو دل اس کا بھی تم سے اُوب گیا
گرا اس آنکھ سے آنسو تو نام ڈوب گیا

گھٹائیں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ و تار
یہ آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار
مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوئے بیدار
تو جان لو کہ ہے اس قوم کی چتا تیار
مٹے گا دین بھی اور آبرو بھی جائے گی
تمہارے نام سے دنیا کو شرم آئے گی

یہ بے گناہ اسی قوم کے ہیں لختِ جگر
کہ جس نے تم کو بھی پالا ہے صورتِ مادر
جگر پہ قوم کے افلاس کا چلے خنجر
غضب خدا کا تمہارے دلوں پہ ہو نہ اثر
اُسی سے بے خبری جس کے دم سے جیتے ہو
اُسے رُلاتے ہو جس ماں کا دودھ پیتے ہو

یہ قحط کیا ہے یہ طاعون کیا ہے کیا ہے وبا
تمہاری قوم پہ نازل ہوا ہے قہرِ خدا
جو راہِ راست سے ہوتی ہے کوئی قوم جدا
اسی طرح اُسے ملتی ہے ایک روز سزا
اسی طرح سے ہوا قوم کی بگڑتی ہے
اسی طرح سے غریبوں کی آہ پڑتی ہے

گناہ قوم کے دھو جائیں اب وہ کام کرو
مٹے کلنک کا ٹیکا وہ فیض عام کرو
نفاق و جہل کو بس دور سے سلام کرو
کچھ اپنی قوم کے بچوں کا انتظام کرو
یہ کام ہو کے رہے چاہے جاں رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

یہ کارِ خیر میں کوشش یہ قوم کا دربار
لگا دو آج تو چاندی کے ہر طرف انبار
یہ سب کہیں کہ ہے زندہ یہ قومِ غیرت دار
ہے اس کے دل میں بزرگوں کی آبرو کا وقار
سروں میں حُبِّ وطن کا جنون باقی ہے
رگوں میں بھیشم و ارجن کا خون باقی ہے

جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں
طمع میں دولتِ دنیا کی یہ اسیر نہیں
امیر دل کے ہیں ظاہر کے یہ امیر نہیں
وہ آدمی نہیں ان کو جو دست گیر نہیں
تمام دولتِ ذاتی لٹائے بیٹھے ہیں
تمہارے واسطے دھونی رمائے بیٹھے ہیں

سوال ان کا ہے تعلیم کا بنے مندر
کلس ہو جس کا ہمالہ سے اوج میں برتر
اسی اُمید پہ یہ گھومتے ہیں شام و سحر
صدا لگاتے ہیں راہِ خدا میں یہ کہہ کر
"وہ خود غرض ہیں ، جو دولت پہ جان دیتے ہیں
وہی ہیں مرد جو وِدّیا کا دان دیتے ہیں"

سوال رد نہ ہو ان کا یہ شرط ہے تدبیر
اسی سے پائیں گے ایمان و آبرو توقیر
یہ ہے ترقیِ قومی کے واسطے اکسیر
بہے علوم کی گنگا پئیں غریب و امیر
وقارِ قوم بڑھے ، دور بے زری ہو جائے
اُجڑ گئی ہے جو کھیتی وہ پھر ہری ہو جائے

جو ہو رہا ہے زمانے میں ، ہے تمھیں معلوم
کہ ہو گئے ہیں گراں کس قدر فنون و علوم
تمہاری قوم سے دولت ہوئی ہے یوں معدوم
کہ اب ترستے ہیں پڑھنے کو سیکڑوں معصوم
وہ خود ترستے ہیں ماں باپ اُن کے روتے ہیں
تمہاری قوم کے بچے تباہ ہوتے ہیں

قومی مسدس

۱۹۱۱ء

پنڈت برج نرائن چکبست

(۱۸۸۲ء - ۱۹۲۶ء)

الٰہی کون فرشتے ہیں یہ گدائے وطن
صفائے قلب سے جن کے یہ بزم ہے روشن
جھکی ہوئی ہے سبھوں کی لحاظ سے گردن
ہر اک زباں پہ ہیں تعظیم اور ادب کے سخن
صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی
خدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی

فقیر علم کے ہیں ان کی داستاں سن لو
پیام قوم کا دکھ درد کا بیاں سن لو
یہ دن وہ دن ہے جو ہے یادگار ہاں سن لو
ہے آج غیرتِ قومی کا امتحاں سن لو
یہی ہے وقت امیروں کی پیشوائی کا
فقیر آئے ہیں کاسہ لئے گدائی کا

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدیدہ سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
رُوحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!
وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!
سادہ و پُر سوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب!
آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب!
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!
نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر!

●●●

کعبۂ اربابِ فن ! سطوتِ دینِ مبین
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم"، صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے، شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و کرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!
دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں

اس کی زمیں بے حدود، اس کا اُفق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل!
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل!
ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل!
مردِ سپاہی ہے، وہ اس کی زرہ لَآاِلٰـــــــــہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لَآاِلٰـــــــــہ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دِنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
قطرۂ خونِ جگر ، سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز ، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور ، مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلّیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میّسر تو کیا
اس کو میّسر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافرِ ہندی ہوں میں ، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود ، لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے ، شوق مری لے میں ہے
نغمۂ اللہ ہُو میرے رگ و پے میں ہے
تیرا جلال و جمال ، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل وہ جمیل ، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پایدار ، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل!
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں ، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات ! کارِ جہاں بے ثبات!
اوّل و آخر فنا ، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو ، منزلِ آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات ، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے ، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!
عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گُل تابناک
عشق ہے صہبائے خام ، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم ، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل ، اس کے ہزاروں مقام!
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات!
عشق سے نورِ حیات ، عشق سے نارِ حیات
اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

مسجدِ قرطبہ

علامہ اقبال

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب ، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب ، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب ، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب ، صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار ، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات ، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو ، جس میں نہ دن ہے نہ رات!

مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم!
لیکن صفتِ عالم لاہوت ہے خاموش!
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش!

(۳)

اک شوخ کرن ، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب!
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب!
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب!
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِّ ناب
اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بے گانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب!
مشرق سے ہو بے زار ، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر!

●●●

شعاعِ اُمید

علامہ اقبال

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام!
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام!
پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام!

(۲)

آفاق کے ہر گوشہ سے اُٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش!
اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش!

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بے گانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات!
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

●●●

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکار شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن ، مرد آزما ، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں ، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
مفلسوں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

(۳)

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق ، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں ، کیا مہر و مہ ، کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست ، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہوا
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار ، آشفتۂ مغز ، آشفتہ ہو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے ، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں ، اسلام ہے

(۲)

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

پانچواں مشیر

(ابلیس کو مخاطب کر کے)

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گِل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز
آبلہِ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف
تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار
گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر، وہ رُوحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا؛ وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

کاروبارِ شہر یاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ 'میر و سلطاں' پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر!
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

تیسرا مشیر

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیم بے تجلّی! وہ مسیحِ بے صلیب!
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پر وہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

چوتھا مشیر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
گاہ بالد چوں صنوبر، گاہ نالد چوں رباب

تیسرا مشیر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب!

پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ 'قوالی' سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟
'ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام!

دوسرا مشیر

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلا مشیر

ہاں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر!
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

علامہ اقبال

ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہان کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!
کون کرسکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کرسکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں!

جبریل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے نخچیر جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جُو بہ جُو!
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح،
تو فقط! اَللّٰہُ ھُوْ، اَللّٰہُ ھُوْ!

●●●

جبریل و ابلیس

علامہ اقبال

جبریل

ہم دمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو!

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوے و آرزو!

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کُو!
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تَقْنَطُوْ اچھا ہے یا لَاتَقْنَطُوْا؟

لوح بھی تُو ، قلم بھی تُو ، تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجر و سلیم ، تیرے جلال کی نمود!
فقرِ جنید و بایزید ، تیرا جمال بے نقاب!
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل ، غیاب و جستجو ! عشق ، حضور و اضطراب!
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے!
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے!
تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علمِ نضیل بے رطب!
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب
گاہ بحیلہ می برد ، گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب ! عشق کی انتہا عجب!
عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجرت میں لذتِ طلب!
عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب!
گرمیِ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق ! قطرہ کی آبرو فراق!

●●●

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات!
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات!
ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات!
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات!
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق!
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!
آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تُو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بُو!
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ مے کدہ کم طلب و تہی کدو!
میں، کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس!
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو!
خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو
فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوے تابدار را

ذوق وشوق

(ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

علامہ اقبال

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں تہی دست رفتن سوے دوستاں

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندّیاں رواں!
حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں!
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب!
کوہِ اصنم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواح کا طمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں!
آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں!
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیشِ دوام ہے یہی

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کی اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

●●●

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تُو جس کا ہے معبود؟
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیرانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات!
رعنائیِ تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات!
یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت!
پیتے ہیں لہو ، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات!
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت!
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!

لینن

(خدا کے حضور میں)

علامہ اقبال

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ زندہ و پایندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تُو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات!
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت!
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آفات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات!

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملّتِ بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نم ناک ہے

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار مہدیٔ اُمت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں ملّتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر!
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر!

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ! دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظمؐ کو ملی جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام ہند ہی بنیاد ہے اس کی، نہ فارس ہے، نہ شام
آہ! یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جس تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

●●●

بلادِ اسلامیہ

علامہ اقبال

سر زمیں دلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے　　ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں　　خانقاہِ عظمت اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار　　نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل ، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی　　اس کرامت کا مگر حق دار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامانِ ناز　　لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوشِ ارم　　جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبرؐ کے قدم

جس کے غنچے تھے چمن ساماں ، وہ گلشن ہے یہی!
کانپتا تھا جن سے روما ، ان کا مدفن ہے یہی!

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودۂ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ!
مسلم امتی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

●●●

ربط و ضبطِ ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر!
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدّم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر!
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر
اے کہ نشناسی خفی را از جلی ، ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش!
عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ!
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ!

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو!

دنیائے اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ نمیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ!
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز!
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پاز
وہ مئے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں نمیاد را ویراں کنند؟
"ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں"
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل و رنگرا!
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر! حاجتے پیشِ سلیماں نے مبر

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات!
دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات!
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک!
نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک؟

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و صلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری!
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری!
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایۂ ومحنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک کے ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو
ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثلِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے!
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سلطنت

آبتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل!
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل!
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل!
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل!
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریٔ کشت و نخیل!
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی!

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی!
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی!
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی!
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
"کشتیِ مسکین" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آباد یاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش!
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش!
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش!
آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

جوابِ خضر

صحرا نوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے؟
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل!

خضرِ راہ

علامہ اقبال

شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا ، ہوا آسودہ ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب!
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب!
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب!
دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن ، رازِ چمن کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ، ٹوٹ گیا سازِ چمن اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہو پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہے تو کیا ، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا ، لے تو حجازی ہے مری

●●●

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی اور پابندیٔ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے پھونک دی گرمیٔ رخسار سے محفل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں، تجھے یاد نہیں

وادیٔ نجد میں وہ شور سلاسل نہ رہا قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا گھر یہ اُجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا
اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کو کو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ھُو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز لے اُڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

یہ شکایت نہیں ، ہیں ان کے خزانے معمور جنہیں محفل میں نہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں ، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب تیری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب
طعنِ اغیار ہے ، رسوائی ہے ، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی ، چاہنے والے بھی گئے شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے ، اپنا صلہ لے بھی گئے آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق ، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

دردِ لیلیٰ بھی وہی ، قیس کا پہلو بھی وہی نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی امتِ احمدؐ مرسل بھی وہی ، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِؐ عربی کو چھوڑا بت گری پیشہ کیا ؟ بت شکنی کو چھوڑا
عشق کو ، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا رسمِ سلمانؓ و اویسِؓ قرنی کو چھوڑا
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

کس کی شمشیر جہاں گیر جہاندار ہوئی کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھُوَاللّٰہُ اَحَد کہتے تھے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے اور معلوم ہے تجکو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

امتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہگار بھی ہیں عجز والے بھی ہیں، مستِ مے پندار بھی ہیں
ان میں کامل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر؟
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی اہلِ چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی، وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے، تو جنگوں کی مصیبت کیلئے اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کیلئے سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی، تو بگڑ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی

شکوہ

علامہ اقبال

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں؟ فکرِ فردا نہ کروں ، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں ، اور ہمہ تن گوش رہوں ہم نوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں ، فریاد سے معمور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم پھول تھا زیبِ چمن ، پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت ترے محبوبؐ کی دیوانی تھی

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو
یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
تو سنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

●●●

گُلِ رنگیں

علامہ اقبال

(۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸ء)

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں　　اے گُلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں　　یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں　　یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں
آہ! یہ دستِ جفا جو اے گُلِ رنگیں نہیں　　کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گل چیں نہیں
کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا
سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے　　راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے　　میں چمن سے دور ہوں، تو بھی چمن سے دور ہے
مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

دربار ۱۹۱۱ء

اکبر الٰہ آبادی

(۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء)

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار
حکم حاکم سے ہوا اجتماعِ انتشار

آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین
پھول اور سبزہ چمک اور روشنی ریل اور تار

کیروسین اور برق اور پٹرولیم اور تارپین
موٹر اور ایروپلین اور جمگھٹے اور اقتدار

مشرقی پتلوں میں تھی خدمت گذاری کی اُمنگ
مغربی شکلوں سے شانِ خود پسندی آشکار

شوکت و اقبال کے مرکز حضور امپرر
زینت و دولت کی دیوی امپرس عالی تبار

بحرِ ہستی لے رہا تھا بے دریغ انگڑائیاں
ٹیمز کی امواج جمنا سے ہوئی تھیں ہم کنار

انقلابِ دہر کے رنگین نقشے پیش تھے
تھے پئے اہلِ بصیرت باغ عبرت میں بہار

ذرّے ویرانوں سے اُٹھے تھے تماشا دیکھنے
چشم حیرت بن گئی تھی گردشِ لیل و نہار

مصلحت آمیز ہر طرز و طریق انتظام
حکمت آگیں ہر ادائے حاکمان نامدار

جامے سے باہر نگاہ ناز فتاحانِ ہند
حدّ قانونی کے اندر آنربلوں کی قطار

خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا
فکرِ ذاتی میں خیال قوم غائب فی المزار

دعوتیں، انعام، اسپیچیں، قواعد، فوج، کیمپ
عزتیں، خوشیاں، اُمیدیں، احتیاطیں اعتبار

پیش رو شاہی تھی پھر ہزہائی نس پھر اہل جاہ
بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار

●●●

شاہوں سے گردن جھکتی نہیں واں طوفاں کشتی رکتی نہیں واں
اے راست گوئی تو ہے وہ افسوں منکر بھی دل سے ہیں جس پہ مفتوں
تلخی میں تیری طرفہ مزا ہے ہر دل میں چبھتی تیری ادا ہے
یہاں نام تیرا جس نے لیا ہے عالم کو اپنا دشمن کیا ہے
پہنچایا جس نے پیغام تیرا جمہور میں وہ بدنام ٹھہرا
کتنوں نے جانا ساحر نبی کو کتنوں نے مانا کافر علی کو
طوفاں اُٹھائے اہل ہدیٰ پر بہتاں باندھے زین العباد پر
نعمان کو دی بدعت سے نسبت کی شافعی پر برپا قیامت
نکلے ائمہ اکثر وطن سے خالی ہوا رے ابن حسن سے
کتنوں کی باندھیں ذلت سے مشکیں کتنوں کے رسّی ڈالی گلے میں
سرمدؔ بتایا اہلِ یقیں کو ٹھہرایا زندیق اربابِ دیں کو
اے کلمۂ دیں تیری بدولت مردوں پہ گزری کیا کیا مصیبت
ٹھہرے جہاں میں بے گانے سب سے تجھ پر ہوئے وہ دیوانے جب سے
دنیا نے ان پر گو ظلم توڑا دامن انہوں نے تیرا نہ چھوڑا
حق کے سب آخر طالب ہوئے ہیں نت حق کے دعوے غالب ہوئے ہیں
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اُجالا حق کا نہ ہوتا مگر بول بالا

اے کلمۂ حق اے سرِ یزداں جس وقت ہو تو پردے سے عریاں
ہو تیرے جس دم انصار تھوڑے دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے
عالم ہو تیرا جب ناشناسا
حالیؔ کو رکھیو اپنا شناسا

●●●

کلمۃ الحق

الطاف حسین حالی

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو — اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی — حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی
ہے ناگواری پہچان تیری — الحق مرد ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے — چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
بے جرم مسموم تو نے کرائے — سولی پہ معصوم تو نے چڑھائے
تو نے صلے میں بخشے ہیں اکثر — سولی کے اورنگ، کانٹوں کے افسر
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر — دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
پڑتی ہے ہل چل ہر مرحلے میں — آتی ہے دنیا اک زلزلے میں
حق معبدوں میں ہوتا ہے داخل — ہوتے ہیں جھوٹے معبود باطل

اے راست گوئی اے تیغ عریاں — تیرا مخالف کیوں نہ ہو دوراں
بہت وحشت آگیں مضموں ہیں تیرے — نت مصلحت پر شب خوں ہیں تیرے
گن تیرے جن پر ظاہر ہوئے ہیں — وہ تیری دھن میں آخر ہوئے ہیں
اٹھتی ہیں دل سے جب تیری موجیں — ہوتی ہیں نازل واں حق کی فوجیں
دیتی ہے ہمت ان کو سہارے — کرتی ہے امید پنہاں اشارے
عزم ان کی مشکل کرتا ہے آساں — دل ان سے لاکھوں کرتا ہے پیاں

فکر نہ اچھی کی نہ بُری کی تیرے سوا دھن ہو نہ کسی کی
کوئی جگہ اس دل میں نہ پائے یاد کوئی بھولے سے نہ آئے
دل میں لگن بس اپنی لگا دے سارے غم اپنے میں کھپا دے
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکتا کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر مار کے جاؤں لات جہاں پر
پاؤں تجھے ایک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

●●●

دل تھاما آپے کو سنبھالا سانس تلک منہ سے نہ نکالا
اور نہ اگر میں کرتی ایسا کیوں کر کرتی اور کرتی کیا
کہہ گئی سچ اک راج کماری "لاچاری پربت سے بھاری"

اے خاوند خداوندوں کے مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خاوندی کا صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو کسی کو بے وارث مت کیجو
کیجو جو کچھ تیری خوشی ہو رانڈ مگر کیجو نہ کسی کو
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا کر تو اسے پیوند زمیں کا
یا یہ نتاویں ریت جہاں کی جس سے گئی پر نیت یہاں کی
قوم سے تو یہ ریت چھڑا دے بندیوں کی بیڑی یہ تڑوا دے

اے عزت اور عظمت والے رحمت اور عدالت والے
دکھڑا تجھ سے کہنا دل کا اک بشریت کا ہے تقاضا
دل پہ ہے جب کوئی برچھی چلتی آہ کلیجہ سے ہے نکلتی
جب کوئی دکھ یاد آجاتا ہے جی بے ساختہ بھر آتا ہے
ورنہ ہے دنیا میں دھرا کیا خواب کا سا اک ہے یہ تماشا
ریت کی سی دیوار ہے دنیا اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے اس نگری کی ریت یہی ہے
رہ گیروں کا بندھا ہے تانتا ایک آتا ہے اک ہے جاتا
تھا نہ کچھ آگے تیرے سوا یاں اور رہے گا کچھ نہ سدا یاں
چاہتی ہوں اک تیری محبت اور نہیں رکھتی کوئی حاجت

تیرے سوا اے رحم کے بانی کون سنے یہ رام کہانی
ایک کہانی ہو تو کہوں میں ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
گر سسرال میں جاتی ہوں میں نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جس وقت ہوں آتی رو رو کر ہوں سب کو رُلاتی
سوچ میں میرے سارا گھر ہے میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی
مہندی میں نے لگانی چھوڑی پٹی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی عطر نہیں میں بھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی بال نہیں برسوں گوندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی اُٹھواڑوں کنگھی نہیں ہوتی
آپ کو یاں تک میں نے مٹایا پر دنیا کو صبر نہ آیا

اے ایمان کے رکھنے والے اے نیت کے پرکھنے والے
میں نہیں رکھتی کام کسی سے چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پہ چلتی تیرے اگر میں چین سے کرتی عمر بسر میں
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی مرضی غم خواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی سے ہم کو ندامت ناک رہے کنبہ میں سلامت
جان کسی کی جائے تو جائے آن میں اپنی فرق نہ آئے
تجھ پہ ہے روشن اے مرے مولا وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا
جان تھی میری آن کی دشمن آن تھی میری جان کی دشمن
آن سنبھالے جان تھی جاتی جان بچائے آن تھی جاتی
طے کرنے تھے سات سمندر حکم یہ تھا ہاں پانوں نہ ہو تر

ایک خوشی نے غم یہ دکھائے ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
چین سے رہنے دیا نہ جی کو کر دیا ملیا میٹ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک اور روؤں تو روؤں کہاں تک
ہنسی سے دل بہلاؤں کیوں کر اوسوں پیاس بجھاؤں کیوں کر
لیٹوں گر سونے کے بہانے پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے
اب کل ہم کو پڑے گی مر کر گور ہے سونی سیج سے بہتر
کوئی نہیں دل کا بہلاوا آ نہیں چکتا میرا بلاوا
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں وہ ارمان بھری برساتیں
رُت گئی ساری سر ٹکراتے اُڑ نہ سکی پر ہوتے ساتے
اے دین اور دنیا کے مالک راجا اور پرجا کے مالک
بے پر اور پردار کے والی اے سارے سنسار کے والی
چیونٹیا ، کیڑا ، مچھر ، بھنگا کچھوا ، مینڈک ، سیپ اور گھونگا
سارے پنچھی اور پکھیرو مور ، پپیہا ، سارس ، پیرو
بھیڑ اور بکری شیر اور چیتے تیرے جلائے ہیں سب جیتے
خاک سے تو نے بیج اُگائے پھر پودے پروان چڑھائے
سیپ کو بخشی تو نے دولت اور بخشا مکھی کو امرت
ہیرا بخشا کان کو تو نے مشک دیا حیوان کو تو نے
جگنو کو بجلی کی چمک دی ذرّے کو کندن کی دمک دی
عام ہے سب پر تیری رحمت ہیں محروم مگر بدقسمت
پہروں سوچتی ہوں یہ بھی میں آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
باپ اور بھائی ، چچا ، بھتیجے سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے
پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا جس کو ہو میری جان کی پروا

اُس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا　　اس سے نہ تو بے زار کچھ ایسا
مینھ کہیں دولت کا ہے برسا　　ہے کوئی پانی تک کو ترسا
رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا　　تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا
پر نہیں اُٹھ سکتی وہ مصیبت　　آئے گی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہو اس رہ گیر کا کیا دل　　مر کے کٹے گی جس کی منزل
اُن بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا　　جن کو نہ ملنے دے گا زمانا
اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی　　مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی
آئیں بہت دنیا میں بہاریں　　عیش کی گھر گھر پڑی پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے　　ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں　　برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی　　وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی
آس ہی کا یاں نام ہے دنیا　　جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ　　جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ
رونا اُن بن باسیوں کا ہے　　دیس نکالا جن کو ہوا ہے
حکم سے تیرے پر نہیں چارا　　کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
قسمت ہی میں جب تھی جدائی　　پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی

اے مرے زور اور قدرت والے　　حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری　　دروازے کی ترے بھکاری
اپنے پرائے کی دھتکاری　　میکے اور سسرال پہ بھاری
سہ کے بہت آزار چلی ہوں　　دنیا سے بے زار چلی ہوں
تجھ پہ ہے، روشن سب دکھ دل کا　　تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے　　لینے کے یاں پڑ گئے دینے

مناجات بیوہ

الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

اے سب سے اوّل اور آخر　　جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے سب داناؤں سے دانا　　سارے توانا ؤں سے توانا
اے سمجھے بوجھے بن سوجھے　　جانے پہچانے بن بوجھے
ہوا سے اونچے اور پربت سے　　چاند سے اور اس نیلی چھت سے
سب سے انوکھے سب سے نرالے　　آنکھ سے اوجھل دل کے اُجالے
ناؤ جہاں کی کھینے والے　　دکھ میں تسلّی دینے والے
جوت ہے تیری جل اور تھل میں　　باس ہے تیری پھول اور پھل میں
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا　　تو پاس اور گھر دور ہے تیرا
سوچ میں دل بہلانے والے　　چنتا میں یاد آنے والے

اے رحمت اور ہیبت والے　　شفقت اور دباغت والے
اے اٹکل اور دھیان سے باہر　　جان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا　　بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا
ایک کو تو نے شاد کیا ہے　　ایک کے دل کو داغ دیا ہے

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں روپے کے جن کے پانوں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں، یارو، دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے اور آدمی ہی چور ہے اور آپ تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور بانگ تانگ ہے دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثلِ رانگ ہے
فولاد سے گڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار نہلا دھلا اُٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی ہی پیر ہے اور آدمی ہی پیر اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے، اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

●●●

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں ، میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال اور آدمی ہی مارے ہے، پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے ، میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ قاضی ، وکیل آدمی ، اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں ، خواہ مخواہ دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلا کے راہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑیں بغل میں مار کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس میں جو پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی "لو" کوئی کہتا ہے "لارے، لا" کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے ، مجیرے ، دائرے ، سارنگیاں بجا گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بہ جا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا اور آدمی ہی ناچے ہیں اور دیکھ پھر مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ہے آدمی ہی لعل و جواہر میں بے بہا اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند سا
بدشکل ، بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

آدمی نامہ

نظیر اکبر آبادی

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال، قطب و غوث، ولی آدمی ہوئے　　منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لئے　　حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا　　شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا برملا　　یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور　　یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور　　شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

لے مفلس اور فقیر سے تا شاہ اور وزیر　　کوڑی وہ دل رُبا ہے کہ ہے سب کے دل پذیر
دیتے ہیں جان کوڑی پہ طفل و جوان و پیر　　کوڑی عجب ہی چیز ہے میں کیا کہوں نظیر
کوڑی کے سب جہان میں ، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

●●●

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو رتھ خانہ فیل خانہ طویلا کہاں سے ہو
منڈوا کے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو
کوڑی کے سب جہان میں ، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں کوڑی کے واسطے آپس میں خون کرتے ہیں کوڑی کے واسطے
یاں تک تو لوگ مرتے ہیں کوڑی کے واسطے جو جان دے گزرتے ہیں کوڑی کے واسطے
کوڑی کے سب جہان میں ، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

گالی و مار کھاتے ہیں کوڑی کے واسطے شرم و حیا اُٹھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
سو ملک چھان آتے ہیں کوڑی کے واسطے مسجد کو دم میں ڈھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
کوڑی کے سب جہان میں ، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بن کوڑی خوردیے کے برابر بھی پت نہ تھی کوڑی جب آئی پاس تو بن بیٹھے سیٹھ جی
آگے گماشتوں کے کھلی ہر طرف بہی پھر وہ جو کچھ کہے تو وہی بات ہے سہی
کوڑی کے سب جہان میں ، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بن کوڑی تھیں جو تیل کی باسی منگوڑیاں کوڑی ہوئی تو چھٹنے لگیں لیتی چوڑیاں
یوں خلق دوڑی ، مکھیاں جوں گڑ پہ دوڑیاں خالق نے کیا ہی چیز بنائی ہیں کوڑیاں
کوڑی کے سب جہان میں ، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

خاصے محل اُٹھاتے ہیں کوڑی کے زور سے پکے کنوئیں کھداتے ہیں کوڑی کے زور سے
پل اور سرا بناتے ہیں کوڑی کے زور سے باغ و چمن لگاتے ہیں کوڑی کے زور سے
کوڑی کے سب جہان میں ، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی

نظیر اکبرآبادی

(۱۷۳۵ء - ۱۸۳۰ء)

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں کھانے کو اُن کے نعمتیں، سو بہترین ہیں
کپڑے بھی اُن کے تن میں، نہایت مہین ہیں سمجھیں ہیں اس کو وہ، جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی بغیر سوتے تھے خالی زمین پر کوڑی ہوئی تو رہنے لگے شہ نشین پر
پٹکے سنہرے بندھ گئے جاموں کی چین پر موتی کے گچھے لگ گئے گھوڑوں کی زین پر
کوڑی کے سب جہان میں، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی ہی چاہتی ہے سدا بادشاہ کو کوڑی ہی تھام لیتی ہے فوج و سپاہ کو
لے کر چھڑی رومال گدا بھی نباہ کو پھرتا ہے ہر دکان پہ کوڑی کی چاہ کو
کوڑی کے سب جہان میں، نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

شاعر اور حیدر نگر

محمد قلی قطب شاہ

سو حضرت کے گوشاں پہ اب سر رکھایا
اُنن ہت تھے حق پیالہ کوثر پلایا
مرے سیس موہن سیرا سوہتا ہے
تخت ہور بخت کا قطب نجم اُچایا
فلک ماوے منڈپ اُچایا ہے رنگ رنگ
پریاں ہور حوراں کوں اُس تل نچایا
دمامے سو بادل کے کھن کا چتر ہے
کلیجا سو سُن دشمناں گڑبڑایا
بدیاں نظراں تھے اس کوں اپسند اتارو
کہ حیدر نگر اُن انتداں بھرایا
محمد قطب شہ بندہ ہے علی کا
علی آپ صدقے دو جگ میں بچایا

●●●

نظمیں

فتنۂ دکھن

محمد قلی قطب شاہ

(۱۵۶۳ء - ۱۶۱۱ء)

ہلجائے جیواں کوں سکی اپ چوٹی کیرے تاب میں
پتلی نمن لڑکائے ہے دل اپ نین محراب میں
کہیا کہ مکھ دکھلا منجے ، چھاتی سوں چھاتی لا منجے
کہتی اپن گھر آ منجے ، بے سد ہوا اس جاب میں
سورج بدن جھلکائے جب، چھپ جائیں تارے لاج سب
دیکھت سوا سکا جوت چھپ ، طاقت نہ رہے مہتاب میں
کیا چلبلی ، سو دھن ہے توں ، ہر فن منے پُر فن ہے توں
ہور فتنۂ دکھن ہے توں ، سر زور ہر یک باب میں
صدقے نبی قطبا سوں مل ، کرتے رلیاں ہر یک تل
لبدائے کر مج جیو دل ، پگلائے جوں قند اب میں

●●●

(۴)

یہ کہنا تو نہیں کافی کہ بس پیارے لگے ہم کو
انہیں کیسے بتائیں ہم کہ وہ کیسے لگے ہم کو
مکیں تھے یا کسی کھوئی ہوئی جنت کی تصویریں
مکاں اس شہر کے بھولے ہوئے سپنے لگے ہم کو
ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو
بہت شفاف تھے جب تک کہ مصروفِ تمنا تھے
مگر اس کارِ دنیا میں بڑے دھبّے لگے ہم کو
جہاں تنہا ہوئے دل میں بھنور سے پڑنے لگتے ہیں
اگرچہ مدتیں گذریں کنارے سے لگے ہم کو

(۳)

صورتیں بدلیں محبت نے جوانی میں بہت
موڑ آئے دردِ ہستی کی کہانی میں بہت
ہر نئے چہرے کے ساتھ اک آرزو جاتی رہی
گم ہوئیں چیزیں مری نقل مکانی میں بہت
کچھ تو میں بھی تنگیِ دل سے تھا گھبرایا ہوا
کچھ کشش بھی تھی فضا کی بے کرانی میں بہت
یاں ترے ملنے سے پہلے اس قدر دوری نہ تھی
فاصلہ کم تھا ملال و شادمانی میں بہت
اب ہوا معلوم دل میں دائرے کیسے بنے
میں جو کنکر پھینکتا رہتا تھا پانی میں بہت

(۲)

مل ہی جائے گا کہیں دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں ، کوئی کہیں رہتا ہے

جس کے سانسوں سے معطر تھے در و بام ترے
اے مکاں بول کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

احمد مشتاق

(۱)

کہیں اُمید سی ہے دل کے نہاں خانے میں
ابھی کچھ وقت لگے گا اسے سمجھانے میں
موسمِ گل ہو کہ پت جھڑ ہو بلا سے اپنی
ہم کہ شامل ہیں نہ کھلنے میں نہ مرجھانے میں
ہم سے مخفی نہیں کچھ رہگذر شوق کا حال
ہم نے اک عمر گذاری ہے ہوا کھانے میں
ہے یوں ہی گھومتے رہنے کا مزا ہی کچھ اور
ایسی لذت نہ پہنچنے میں نہ رہ جانے میں
نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں
موسموں کا کوئی محرم ہو تو اس سے پوچھوں
کتنے پت جھڑ ابھی باقی ہیں بہار آنے میں

(۴)

سرگشتۂ سراب تھے دشت صدا کے ہم
ایسے کہ خود بھٹک گئے رستہ دکھا کے ہم

اب پول کھل بھی جائے اگر شہر میں تو کیا
آگے بہت نکل گئے دھومیں مچا کے ہم

اندر کی دھوپ ہی کہیں اب راس ہو تو ہو
بھیگے ہوئے ہیں ایک نم نارسا کے ہم

اب تیسری طرف میں بھٹکتا ہے دھیان کیا
منکر ہیں اپنے اور ہیں کافر خدا کے ہم

اب روٹھ ہی گیا ہے تو اس کو منائیں بھی
آخر کو لوٹ آئے ہیں کچھ دور جا کے ہم

جینے کا اک جواز تو ہو جھوٹ سچ کہیں
یوں، زندہ رہ بھی سکتے ہیں اس کو بھلا کے ہم

(۳)

قافیہ چاہئے کھانے کے لئے　　یعنی مطلعے میں کھپانے کے لئے
خوشہ چینوں کو خبر ہے شاید　　میں کماتا ہوں لٹانے کے لئے
سب سے پہلے سنی اس نے مری بات　　بزم سے مجھ کو اُٹھانے کے لئے
مفت میں اس سے لڑائی لے لی　　کوئی پہنچا نہ چھڑانے کے لئے
ہوا ایجاد خوشی کا تکیہ　　غم کی میعاد بڑھانے کے لئے
کچھ ہوا چاہیے آخر مجھ کو　　سانس کا سکھ بجانے کے لئے

شاعری اصل کہاں ہے ؟ کہ ظفرؔ
دانت ہیں یہ تو دکھانے کے لئے

(۲)

ایک ہی نقش ہے جتنا بھی جہاں رہ جائے
آگ اُڑتی پھرے ہر سو کہ دھواں رہ جائے

کچھ غرض اس سے نہیں رزق گدا ہو کہ نہ ہو
کوچہ و راہ میں آواز سگاں رہ جائے

یہ سفر وہ ہے کہ اتنا بھی غنیمت ہے اگر
اپنے ہمراہ یہی خاک رواں رہ جائے

آج کل اس کی طرح ہم بھی ہیں خالی خالی
ایک دو دن اسے کہیو کہ یہاں رہ جائے

کچھ تو رہ جائے تگ و تاز طلب میں باقی
وہم اپنا رہے یا اس کا گماں رہ جائے

یہ بھی اک مرحلۂ سخت ہے اے صاحب طرز
کہ بیاں کی جگہ انداز بیاں رہ جائے

نام تو پھر بھی بڑی بات ہے دنیا میں ظفر
یہی کیا کم ہے جو کچھ اپنا نشاں رہ جائے

ظفر اقبال

(۱)

ہزار ربط بڑھائیں خیال خام سے ہم
نکل نہ پائیں گے تنہائیوں کے دام سے ہم

جو شام غم میں لبوں پر لرز گیا کئی بار
کبھی کے بھاگے ہوئے تھے اس ایک نام سے ہم

الجھ رہیں گے کسی اور بحر بے تہہ میں
نکل بھی جائیں اگر سیل صبح و شام سے ہم

یہ اور بات کہ صحبت ہی مل گئی ایسی
وگرنہ شہر میں آئے تھے اپنے کام سے ہم

جو دوسروں کے لئے آب دار رکھتے تھے
ہوئے ہیں قتل اسی تیغ بے نیام سے ہم

ہمارے زخم نہاں پر فسردہ ہو نہ کوئی
ہیں پر بہار اسی نقش ناتمام سے ہم

ہمارے زخم نہاں پر فسردہ ہو نہ کوئی
ہیں پُر بہار اسی نقش ناتمام سے ہم

(۴)

ویران ہو گیا ہے پھر آئینہ آب کا
دریا پہ کوئی رنگ نہ ٹھہرا سحاب کا

یوں ہی صدا لگا دی تھی آکر ترنگ میں
یاں کون منتظر ہے کسی کے جواب کا

اندھی ہوا کہاں سے اڑا لائی کیا خبر
کیا جانے زندگی ہے ورق کس کتاب کا

کچھ دیر تک تو زخم کی آہٹ نہ مل سکی
خنجر بھی تھا صدا کا بڑی آب و تاب کا

پتھر میں ڈھلتا جاتا ہے میرا بدن تمام
یہ واقعہ ہے یا کوئی منظر ہے خواب کا

اب یہ سیہ خمار گرانی ہے کیسی زیبؔ
اترا ہے سر کے ساتھ نشہ کس عذاب کا

(۳)

بے حسی پر مری وہ خوش تھا کہ پتھر ہی تو ہے
میں بھی چپ تھا کہ چلو سینے میں خنجر ہی تو ہے

دھوکے تو میرا لہو اپنے ہنر کو نہ چھپا
کہ یہ سرخی تری شمشیر کا جوہر ہی تو ہے

راہ تو نکلی کوئی توڑ کے چٹانوں کو
سامنے تیرہ و تاریک سمندر ہی تو ہے

ساتھ ہوں میں بھی کہ دل کی یہی مرضی ہے مگر
دشت بھی بے در و دیوار کا اک گھر ہی تو ہے

تھک کے خوابوں کی گذرگاہ سے اُٹھ آیا میں زیب
کون دیکھے وہی دیکھا ہوا منظر ہی تو ہے

(۲)

وہ کہہ رہا ہے ، یہی ہے شکستہ تن میرا
نہ میری شکل نہ صورت نہ بانکپن میرا
مرے سوا نہ تھا صحرا میں دور دور کوئی
کسے بتاؤں کہ تھا کون راہ زن میرا
چمک رہی ہیں خلا میں ہزار دنیائیں
نہ جانے کون سے ذرے میں ہے وطن میرا
گھرا ہوں اپنی ہی پرچھائیوں میں چار طرف
پڑا ہے اب کے عجب دشمنوں سے رن میرا
خموش بیٹھنا چاہوں تو دشت چھیڑتا ہے
یہاں بھی کوئی نکل آیا ، ہم سخن میرا
یہ آسمان ، یہ صحرائے بے شکن ، یہ سکوت
سفر میں زیب کہاں چھٹ گیا بدن میرا

زیب غوری

(وفات:۱۹۸۵ء)

(۱)

گوہر ، صدف لباس سے باہر نکال لے
نیرنگ روشنی کا یہ پیکر نکال لے
اب میرے سامنے مرا اپنا وجود ہے
تلوار سے مری کوئی جوہر نکال لے
بے رنگ ساعتوں میں کبھی کام آئے گا
دریا سے ڈوبتا ہوا منظر نکال لے
کچھ میں بھی بادبان شکستہ سنبھال لوں
جب تک ہوا بھی ٹوٹے ہوئے پر نکال لے
دل کے شرر کو تازہ ہوا آرزو کی دے
پانی میں ہاتھ ڈال کے پتھر نکال لے
اتنا بھی دوستوں سے نہ ہو زیبؔ نااُمید
کب کوئی آستین سے خنجر نکال لے

(۴)

زوالِ شب میں کسی کی صدا نکل آئے
ستارہ ڈوبے ستارہ نما نکل آئے
عجب نہیں کہ یہ دریا نظر کا دھوکا ہو
عجب نہیں کہ کوئی راستہ نکل آئے
یہ کس نے دستِ بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے
بڑی گھٹن ہے، چراغوں کا کیا خیال کروں
اب اس طرف کوئی موجِ ہوا نکل آئے
خدا کرے صفِ سرداگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

(۳)

مری طرف تری موج نوا چلی ہے نہیں
ہوا کبھی سر دشت بلا چلی ہی نہیں
تمام فیصلے بس ایک شخص کرتا تھا
وہاں یہ بحثِ خطا و سزا چلی ہی نہیں
دل و زباں میں کبھی جیسے رابطہ ہی نہ تھا
اُٹھے بھی ہاتھ تو رسم دعا چلی ہی نہیں
یہ مت سمجھ کہ ترے قتل کا خیال نہ تھا
نکل چکی تھی مگر بے وفا چلی ہی نہیں
میں چاہتا تھا کہ کچھ سرکشی کی داد ملے
تو اب کے شہر میں تیغ جفا چلی ہی نہیں
بہت خراب تھی شعلہ گروں کی قسمت بھی
مکان اور بھی جلتے ہوا چلی ہی نہیں

(۳)

بہت دنوں تو رہا اپنا نکتہ چین بھی میں
پھر اپنے آپ پہ کرنے لگا یقین بھی میں
مری طرف ہی رواں ہے مری کمند ہوس
یہاں غزال بھی میں ہوں سبکتگین بھی میں
عذاب مجھ سے مجھی پر اترتے رہتے ہیں
فراز عرش بھی میں پستی زمین بھی میں
اب اپنے آپ کو کس طرح بے بہا کہیے
نگیں شناس بھی میں دانۂ نگین بھی میں
گدا و شاہ سے میرا تپاک ایک سا ہے
کہ کج کلاہ بھی میں ، بوریا نشین بھی میں
مجھے وہ آنکھ نہ دیکھے تو میں ہی سب سے خراب
وہ انتخاب جو کر لے تو بہترین بھی میں

عرفان صدیقی

(۱۹۳۹ء - ۲۰۰۴ء)

(۱)

کوزہ گر پھر اسی مٹی میں ملاتا ہے مجھے
دیکھئے اب کے وہ کیا چیز بناتا ہے مجھے

میں تو اس دشت میں خود آیا تھا کرنے کو شکار
کون یہ زین سے باندھ لئے جاتا ہے مجھے

خاک پر جب بھی کوئی تیر گرا دیتا ہے
دست دلدار کوئی بڑھ کے اُٹھاتا ہے مجھے

ساعت چند کروں مشقِ گراں جانی بھی
جاں سپاری کا ہنر تو بہت آتا ہے مجھے

دولتِ سر ہوں ، سو ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے ، نیزے پہ سجاتا ہے مجھے

(۴)

زمین خاک ، فلک راکھ چل سکو تو چلو
خود اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو
یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو
ہر اک سفر کو ہے محفوظ راستوں کی تلاش
حفاظتوں کی روایت بدل سکو تو چلو
یہی ہے زندگی کچھ خواب چند اُمیدیں
انہیں کھلونوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو

(۳)

محبت میں وفاداری سے بچیے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیے
ہر اک صورت بھلی لگتی ہے کچھ دن
لہو کی شعبدہ کاری سے بچیے
شرافت ، آدمیت ، دردمندی
بڑے شہروں میں بیماری سے بچیے
ضروری کیا ہر اک محفل میں بیٹھیں
تکلف کی رواداری سے بچیے
بنا پیروں کے سر چلتے نہیں ہیں
بزرگوں کی سمجھ داری سے بچیے

(۲)

بات کم کیجئے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے یاں دوست بناتے رہیے
دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے
یہ تو چہرے کا فقط عکس ہے تصویر نہیں
اس پہ کچھ رنگ ابھی اور چڑھاتے رہیے
غم ہے آوارہ اکیلے میں بھٹک جاتا ہے
جس جگہ رہئے وہاں ملتے ملاتے رہیے
جانے کب چاند بکھر جائے گھنے جنگل میں
گھر کی چوکھٹ پہ کوئی دیپ جلاتے رہیے

ندا فاضلی

(پیدائش: ۱۹۳۸ء)

(۱)

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمین کہیں آسماں نہیں ملتا
تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں اُمید ہو اس کی وہاں نہیں ملتا
کہاں چراغ جلائیں، کہاں گلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں لیکن مکاں نہیں ملتا
یہ کیا عذاب ہے سب اپنے آپ میں گم ہیں
زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا
چراغ جلتے ہی بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشاں نہیں ملتا

(۴)

دل میں اُترے گی تو پوچھے گی جنوں کتنا ہے
نوکِ خنجر ہی بتائے گی کہ خوں کتنا ہے
آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچمِ خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے
جمع کرتے رہے جو اپنے کو ذرّہ ، ذرّہ
وہ یہ کیا جانیں بکھرنے میں سکوں کتنا ہے
وہ جو پیاسے تھے سمندر سے بھی پیاسے لوٹے
ان سے پوچھو کہ سرابوں میں فسوں کتنا ہے
ایک ہی مٹی سے ہم دونوں بنے ہیں لیکن
تجھ میں اور مجھ میں مگر فاصلہ یوں کتنا ہے

(۳)

آندھیاں آتی تھیں ، لیکن کبھی ایسا نہ ہوا
خوف کے مارے جدا شاخ سے پتا نہ ہوا

رُوح نے پیرہن جسم بدل بھی ڈالا
یہ الگ بات کسی بزم میں چرچا نہ ہوا

رات کو دن سے ملانے کی ہوس تھی ہم کو
کام اچھا نہ تھا انجام بھی اچھا نہ ہوا

وقت کی ڈور کو تھامے رہے مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا

خوب دنیا ہے کہ سورج سے رقابت تھی جنھیں
اُن کو حاصل کسی دیوار کا سایا نہ ہوا

(۲)

مشعلِ درد پھر اک بار جلا لی جائے
جشن ہو جائے ذرا دھوم مچا لی جائے
خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گذرا
دوستو ، آؤ کوئی بات نکالی جائے
جان بھی میری چلی جائے تو کچھ بات نہیں
وار تیرا نہ مگر ایک بھی خالی جائے
جو بھی ملنا ہے ترے در ہی سے ملنا ہے اسے
در ترا چھوڑ کے کیسے یہ سوالی جائے
وصل کی صبح کے ہونے میں ہے کچھ دیر ابھی
داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھالی جائے

شہریار

(پیدائش:۱۹۳۶ء)

(۱)

دھوپ کے دشت میں بے سایہ شجر میں ہم تھے
منہمک پھر بھی سرابوں کے سفر میں ہم تھے

منتشر کر چکی آندھی تو یہ معلوم ہوا
اک بگولے کی طرح ریت کے گھر میں ہم تھے

تیری آواز کے جادو نے خبردار کیا
ناسمجھ تھے کہ بلاؤں کے اثر میں ہم تھے

تانہ شاکی رہے دریائے ہوس کی کوئی موج
بادباں جسم کے کھولے کہ بھنور میں ہم تھے

یہ ترے قرب کا اعجاز ہے ورنہ پہلے
طاق اتنے کہاں جینے کے ہنر میں ہم تھے

(۴)

آج اک لہر بھی پانی میں نہ تھی　　کوئی تصویر روانی میں نہ تھی
ولولہ مصرعۂ اوّل میں نہ تھا　　حرکت مصرعۂ ثانی میں نہ تھی
کوئی آہنگ نہ الفاظ میں تھا　　کیفیت کوئی معانی میں نہ تھی
کوئی مفہوم تصور میں نہ تھا　　کوئی بھی بات کہانی میں نہ تھی
رنگ اب کوئی خلاؤں میں نہ تھا　　کوئی پہچان نشانی میں نہ تھی
رنج بھولے ہوئے وعدے کا نہ تھا　　لذت اب یاد دہانی میں نہ تھی

لو کہ جامد سی غزل بھی لکھ دی
آج کچھ زندگی بانی میں نہ تھی

(۳)

اس تند سیاہی کے پگھلنے کی خبر دے
دے پہلی اذاں ، رات کے ڈھلنے کی خبر دے
اے ساعت اول کے ضیا ساز فرشتے
رنگوں کی سواری کے نکلنے کی خبر دے
طائر کو دے آزاد اُڑانوں کی فضائیں
کہسار کو دریا کے اُچھلنے کی خبر دے
ہر آن صداؤں کو نئے راگ عطا کر
ہر لمحہ مناظر کے بدلنے کی خبر دے
سب کو سفر و سمت پسندی کا دے مژدہ
اب گھاٹ کی سب کشتیاں چلنے کی خبر دے

(۲)

عجیب رونا سسکنا نواحِ جاں میں ہے
یہ اور کون مرے ساتھ امتحاں میں ہے
یہ رات گزرے تو دیکھوں طرف طرف کیا ہے
ابھی تو میرے لئے سب کچھ آسماں میں ہے
کٹے گا سر بھی اسی کا کہ یہ عجب کردار
کبھی الگ بھی ہے، شامل بھی داستاں میں ہے
تمام شہر کو مسمار کر رہی ہے ہوا
میں دیکھتا ہوں وہ محفوظ کس مکاں میں ہے
نہ جانے کس سے تری گفتگو رہی باقی
یہ ایک زہرا کہ اب تک تری زباں میں ہے

مَن چندا بانی

(۱۹۳۲ء - ۱۹۸۱ء)

(۱)

ہم ہیں ، منظرِ سیہ آسمانوں کا ہے
اک عتاب آتے جاتے زمانوں کا ہے

ایک زہراب غم ، سینہ سینہ سفر
ایک کردار ، سب داستانوں کا ہے

کس مسلسل اُفق کے مقابل ہیں ہم
کیا عجب سلسلہ امتحانوں کا ہے

پھر ہوئی ہے ہمیں مٹیوں کی تلاش
ہم ہیں اڑتا سفر اب ڈھلانوں کا ہے

کون سے معرکے ہم نے سر کر لئے
یہ نشہ سا ہمیں کن تکانوں کا ہے

یہ الگ بات ، وہ کچھ بتائے نہیں
لیکن اس کو پتہ سب خزانوں کا ہے

سب چلے دوڑ کے پانیوں کی طرف
کیا نظارہ کھلے بادبانوں کا ہے

اس کی نظروں میں سارے مقامات ہیں
پر اسے شوق اندھی اُڑانوں کا ہے

آؤ بانی کہ خواجہ کے در کو چلیں
آستانہ ہزار آستانوں کا ہے

(۴)

پرسشِ التفات سے اور قلق سوا ہوا
حرفِ تپاکِ حس میں زہر سا تھا ملا ہوا

یوں بھی ہزار کاہش باعثِ اضطراب تھیں
اور تری جدائی کا زخم بھی تھا لگا ہوا

موت کی طرح دفعتاً ساعتِ ہجر آئی تھی
جیسے چراغ جل بجھے مجھ سے وہ یوں جدا ہوا

میرا ملال بے سبب تجھ پہ کہیں گراں نہ ہو
آج نہ مل کہ آج تو دل ہے بہت دُکھا ہوا

آئینہ خانۂ جہاں میرے لئے وَبال ہے
نکلا تری تلاش میں اپنا ہی سامنا ہوا

زرد تمام برگ تھے سارے نشانِ مرگ تھے
ایسی گھٹا برس پڑی باغ مرا ہرا ہوا

بادِ بہارِ شوق نے پھول نئے کھلا دیئے
رُوح کی تازگی نہ پوچھ سارا بدن نیا ہوا

(۳)

کسی نے بھی مجھے سمجھا نہیں ہے
یہ شکوہ ہے کوئی دعویٰ نہیں ہے
تجھے چاہا ہے جس ساعت میں، میں نے
وہ ساری عمر ہے لمحہ نہیں ہے
ابھی ہوں ایک مبہم سا تصوّر
ابھی اس نے مجھے سوچا نہیں ہے
سکون اس راہ میں کیا ڈھونڈتے ہو
یہ صحرا ہے یہاں سایہ نہیں ہے
لکیروں میں چھپی ہیں صورتیں کچھ
مصوّر نے جنھیں دیکھا نہیں ہے
چلی ہے موج میں کاغذ کی کشتی
اسے دریا کا اندازہ نہیں ہے

(۲)

کیسا لمحہ تھا وہ کیا وقت سفر آیا تھا
میں تری بزم سے بادیدۂ تر آیا تھا
تیری شاخوں پہ کسی طائر وحشی کی طرح
میں گھنی چھاؤں میں دم لینے اُتر آیا تھا
وہ تری یاد تھی دل میں کہ مسافر کوئی
ایک شب کے لئے پردیس سے گھر آیا تھا
اس کو منزل نہ کہو وہ میری واماندگی تھی
راہ میں مرحلۂ ترک سفر آیا تھا
ایک تتلی کی طرح لمس کی لذت سے سلیم
رنگ اس کا مرے ہاتھوں پہ اُتر آیا تھا

سلیم احمد

(۱۹۲۷ء - ۱۹۸۳ء)

(۱)

نایاب ہیں اتنے کہ جہاں میں نہیں ملتے
ہم کار گہہِ سود و زیاں میں نہیں ملتے

دیکھا ہے ہر اک حرف کے سینے میں اُتر کر
وہ معنیٔ ناگفتہ زباں میں نہیں ملتے

سینہ میں وہ کچھ اور تھا لفظوں میں ہے کچھ اور
غم کے کئی انداز بیاں میں نہیں ملتے

صورت سے جو ظاہر ہے وہ دل میں نہیں تیرے
جو رنگ بدن میں ہیں وہ جاں میں نہیں ملتے

مجھ تک نہیں آئے تو ہدف کون تھا ان کا
جو تیر تھے ترکش میں کماں میں نہیں ملتے

خود میں نے بنائے کہ بہل جائے مرا دل
کچھ ایسے کھلونے جو دکاں میں نہیں ملتے

لے آیا ہوں میں توڑ کے شاخوں سے وفا کی
یہ پھول ترے صحنِ مکاں میں نہیں ملتے

(۴)

تحریر ہر نگہ میں کسی خواب کی رہی
اتنی تو راستوں میں مرے روشنی رہی

در بھی نہیں تھا کوئی ، دریچے بھی بند تھے
آنکھوں میں جانے کیسے دھنک سی رچی رہی

خوشبو کے ساتھ ساتھ نہ جانے کہاں تھی میں
پھر یوں ہوا کہ گردشِ دوراں تھمی رہی

پتوں سے چھن کے آئی ہے آنگن میں چاندنی
جیسے کسی خوشی میں خوشی کی کمی رہی

اک سلسبیلِ درد مرے ساحلوں پہ تھی
دریا میں موج موج مری تشنگی رہی

وہ اتنا مہرباں ہے کہ اب اس سے کیا کہوں
کتنی گواہیوں میں مری زندگی رہی

دل کو اُداس کر گئی جو نوحہ گر ہوا
کونپل کو اعتبارِ نمو سونپتی رہی

گلدان میں سجا تو لئے شوق سے ادا
پھولوں سے بے طرح مجھے شرمندگی رہی

(۳)

نہ بام و دشت، نہ دریا، نہ کوہسار ملے
جنوں کی راہ تھی حالات سازگار ملے

لبوں پہ حرفِ شکایت بھی آ کے ٹوٹ گیا
وہ خود فگار تھے جو ہاتھ سنگ بار ملے

ادھر فصیلِ شبِ غم، ادھر ہے شہر پناہ
صبا سے کہیو وہی آ کے ایک بار ملے

یہ بے بسی تو مرے عہد کا مقدر تھی
دلوں کو داغِ تمنا بھی مستعار ملے

ہتھیلیوں پہ چراغ دعا سجائے ہوئے
ملے نگار بہاراں تو شرمسار ملے

کوئی تو راہِ تمنا میں ہم سفر ہوتا
کوئی تو کوئے وفا میں خطا شعار ملے

محبتوں سے تو پہلے ہی کیا توقع تھی
مروتوں کے بھی دامان تار تار ملے

میں کیسے اپنے خد و خال آج پہچانوں
جو آئینہ ملے، آلودۂ غبار ملے

مری طلب کی یہ معراج ہے کہ عجزِ ادا
جدھر سے گزروں، وہی ایک رہ گزار ملے

(۲)

یہ حکم ہے تری راہوں میں دوسرا نہ ملے
شمیمِ جاں! تجھے پیراہنِ صبا نہ ملے

بجھی ہوئی ہیں نگاہیں، غبار ہے کہ دھواں
وہ راستہ ہے کہ اپنا بھی نقشِ پا نہ ملے

جمالِ شب مرے خوابوں کی روشنی تک ہے
خدا نگر وہ چراغوں کی لو بڑھا نہ ملے

قدم قدم مری ویرانیوں کے رنگ محل
دلوں کو زخم کی سوغات خسروانہ ملے

تم اس دیار میں انساں کو ڈھونڈتی ہو جہاں
وفا ملے تو بہ احساسِ مجرمانہ ملے

گئے دنوں کے حوالے سے تم کو پہچانا
ہم آج خود سے ملے اور والہانہ ملے

کدھر سے سنگ چلا تھا ادا کہاں پہنچا
جو ایک ٹھیس سے ٹوٹیں، انہیں بہانہ ملے

آدا جعفری

(پیدائش:۱۹۲۶ء)

(۱)

گفتار میں بے ساختہ پن اب بھی وہی ہے
چپ ہیں کہ تب و تابِ سخن اب بھی وہی ہے

لفظوں کے تراشیدہ صنم چپ تو نہیں ہیں
لہجے کی درخشندہ کرن اب بھی وہی ہے

اب بھی وہی میلے ہیں سرِ دشتِ تمنا
حیران غزالوں کا وطن اب بھی وہی ہے

بدلے تو نہیں ہیں وہ دل و جاں کے قرینے
آنکھوں کی جلن دل کی چبھن اب بھی وہی ہے

کیا اب بھی دیے نقشِ کفِ پا کے بجھیں گے
ہر سلسلۂ کوہ و دمن اب بھی وہی ہے

اوراقِ گل و لالہ بہم اب بھی نہیں ہیں
اندازِ نہالانِ چمن اب بھی وہی ہے

اب کے بھی علاجِ دلِ خوددار نہ ہوگا
اے چارہ گرو! دردشکن اب بھی وہی ہے

طغیانِ انا ہو کہ سراسیمگیِ جاں
یارب! ترا شہ پارۂ فن اب بھی وہی ہے

(۴)

ترے ملنے کو بے کل ہوگئے ہیں مگر یہ لوگ پاگل ہوگئے ہیں
بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم وہ گھر سنسان جنگل ہوگئے ہیں
یہاں تک بڑھ گئے آلامِ ہستی کہ دل کے حوصلے شل ہوگئے ہیں
کہاں تک تاب لائے ناتواں دل کہ صدمے اب مسلسل ہوگئے ہیں
نگاہِ یاس کو نیند آ رہی ہے مژہ پر اشک بوجھل ہوگئے ہیں
انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ یہاں جو حادثے کل ہوگئے ہیں
جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصرؔ
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں

(۳)

حاصلِ عشق ترا حسنِ پشیماں ہی سہی
مری حسرت تری صورت سے نمایاں ہی سہی
حسن بھی حسن ہے محتاجِ نظر ہے جب تک
شعلۂ عشق چراغِ تہِ داماں ہی سہی
کیا خبر خاک ہی سے کوئی کرن پھوٹ پڑے
ذوقِ آوارگیِ دشت و بیاباں ہی سہی
پردۂ گل ہی سے شاید کوئی آواز آئے
فرصتِ سیر و تماشائے بہاراں ہی سہی

(۲)

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسے اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فن کار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ
جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان
دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ
ناصؔر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اُداس
وہی پرانی باتیں اُس کی وہی پرانا روگ

ناصر کاظمی

(۱۹۲۵ء - ۱۹۷۴ء)

(۱)

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
قسمتوں کے دیے بجھائے گئے
آہ وہ خلوتوں کے سرمائے
مجمعِ عام میں لٹائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصرؔ
خار و خس کی طرح بہائے گئے

(۴)

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو ، یہ رسم اُٹھا دی جائے

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈھ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

ہم کو گزری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

انہی گلرنگ دریچوں سے سحر جھانکے گی
کیوں نہ کھلتے ہوئے زخموں کو دعا دی جائے

کم نہیں نشے میں جاڑے کی گلابی راتیں
اور اگر تیری جوانی بھی ملا دی جائے

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے ، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

(۳)

صبح کی آس کسی لمحے جو گھٹ جاتی ہے
زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے

شام ڈھلتے ہی ترا درد چمک اٹھتا ہے
تیرگی دور تلک رات کی، چھٹ جاتی ہے

اپنے تابندہ خیالوں کو چھپا کر مت رکھ
روشنی کم نہیں ہوتی ہے جو بٹ جاتی ہے

برف سینوں کی نہ پگھلے تو یہی رودِ حیات
جوئے کم آب کی مانند سمٹ جاتی ہے

آہٹیں کون سی خوابوں میں بسی ہیں جانے
آج بھی رات گئے نیند اُچٹ جاتی ہے

ہاں خبردار! کہ اک لغزشِ پا سے بھی کبھی
ساری تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے

جاں نثار اختر

(۱۹۱۴ء - ۱۹۷۶ء)

(۱)

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لئے در پہ کھڑی ہے یارو

ہم نے صدیوں انھیں ذرّوں سے محبت کی
چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو

فاصلہ چند قدم کا ہے، منا لیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

جب بھی چاہیں گے زمانے کو بدل ڈالیں گے
صرف کہنے کے لئے بات بڑی ہے یارو

اُن کے بن جی کے دکھا دیں گے انھیں یونہی سی
بات اتنی ہے کہ ضد آن پڑی ہے یارو

(۴)

جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا　　کاش میں پیڑوں کا سایہ ہوتا
زخمِ عریاں تو نہ دیکھے گا کوئی　　میں نے کچھ بھیس ہی بدلا ہوتا
بن میں بھی ساتھ گئے ہیں سائے　　میں کسی جا تو اکیلا ہوتا
اور بھی ٹوٹ کے آتی تری یاد　　میں جو کچھ دن تجھے بھولا ہوتا
اور کچھ دور تو چلتے مرے ساتھ　　اور اک موڑ تو کاٹا ہوتا
تھی مقدر میں خزاں ہی تو طلیبؔ
میں کسی دشت میں مہکا ہوتا

(۳)

ہم جنس اگر ملے نہ کوئی آسمان پر
بہتر ہے خاک ڈالئے ایسی اُڑان پر
آکر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
پوچھو سمندروں سے کبھی خاک کا پتہ
دیکھو ہوا کا نقش ، کبھی بادبان پر
یاروں میں اس نظر کی بلندی کو کیا کروں
سایہ بھی اپنا دیکھتا ہوں آسمان پر
کتنے ہی زخم ہیں مرے اک زخم میں چھپے
کتنے ہی تیر آنے لگے اک نشان پر
سایہ نہیں تھا نیند کا آنکھوں میں دور تک
بکھرے تھے روشنی کے نگیں آسمان پر
حق بات آ کے رک سی گئی تھی کبھی شکیبؔ
چھالے پڑے ہوئے ہیں ابھی تک زبان پر

(۲)

خموشی بول اُٹھے ، ہر نظر پیغام ہو جائے
یہ سناٹا اگر حد سے بڑھے کہرام ہو جائے
ستارے مشعلیں لے کر مجھے بھی ڈھونڈنے نکلیں
میں رستہ بھول جاؤں ، جنگلوں میں شامل ہو جائے
میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں
خود اپنی چاپ سن کر لرزہ براندام ہو جائے
مثال ایسی ہے اس دورِ خرد کے ہوش مندوں کی
نہ ہو دامن میں ذرّہ اور صحرا نام ہو جائے
شکیبؔ اپنے تعارف کے لئے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

شکیبؔ جلالی

(۱۹۱۲ء - ۱۹۴۴ء)

(۱)

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے، سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

بُرا نہ مانئے لوگوں کی عیب جوئی کا
انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اپنے
وہ دور کوئی جزیرا دکھائی دیتا ہے

وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں
پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

مری نگاہ سے چھپ کر کہاں رہے گا کوئی
کہ اب تو سنگ بھی شیشا دکھائی دیتا ہے

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی
زمیں سے ہر کوئی اونچا دکھائی دیتا ہے

کھلی ہے دل میں کسی کے بدن کی دھوپ شکیبؔ
ہر ایک پھول سنہرا دکھائی دیتا ہے

(۴)

تری اُمید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے
کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلا ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے
ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے
اگر شرر ہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے
کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

(۳)

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابلِ صفِ اعدا جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی
کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی
یہ برہمن کا کرم ، وہ عطائے شیخِ حرم
کبھی حیات کبھی مئے حرام ہوتی رہی
جو کچھ بھی بننا پڑا فیضؔ لٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی

(۲)

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہ گزار چلے گئے
تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبط حال سے روٹھ کر مرے غم گسار چلے گئے
نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں، نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن، یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

فیض احمد فیضؔ

(۱۹۱۱ء - ۱۹۸۴ء)

(۱)

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شئے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

بکھری اک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گل چیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یوں ہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

(۴)

چلمن سے وہ ہماری نظر دیکھتے رہے
ہم اپنی بے خودی کا اثر دیکھتے رہے
شعروں میں سب کمال و ہنر دیکھتے رہے
ہم اپنا رنگِ خونِ جگر دیکھتے رہے
ہاں داد دے ، اسی نگہِ پردہ در سے ہم
جنبش میں تیرا پردۂ در دیکھتے رہے
ہر منظرِ حسیں پہ ہماری نظر اٹھی
تیری قسم تجھی کو مگر دیکھتے رہے
منزل پہ بھی پہنچ کے نہ آئی سکوں کی نیند
ہم ساری رات خوابِ سفر دیکھتے رہے
مرغانِ پر بریدہ کی آزادیاں نہ پوچھ
اُڑتے ہوئے ہواؤں میں پَر دیکھتے رہے
دل کے اک ایک ٹکڑے میں ہم چشمِ طنز سے
عکسِ شکستِ آئینہ گر دیکھتے رہے

(۳)

بت گری جمال میں گزرا عہدِ کفر ایک حال میں گزرا
وقت گزرا جو بے خیالی میں وہ ترے ہی خیال میں گزرا
کچھ کٹا وقت رنجِ دوری میں کچھ خیالِ وصال میں گزرا
ہائے وہ زخم جن کا موسمِ گل دہشتِ اندمال میں گزرا
پھر دھڑکنے لگا ہے دل اپنا کیا کہوں کیا خیال میں گزرا
نگہِ دوست کا بھی موسمِ لطف دل ہی کی دیکھ بھال میں گزرا
ایک لمحہ میں کتنے سال کٹے
ایک لمحہ بھی سال میں گزرا

(۲)

خاموشی بحرانِ صدا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
سناٹا تک چیخ رہا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
ترکِ تعلق کر کے زباں سے دل کا جینا مشکل ہے
یہ کیسا آہنگِ وفا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
دل والوں کی خاموشی ہی بارِ سماعت ہوتی ہے
بے آوازی کربِ فضا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
بھیس بدلتی آوازیں ہی شام و سحر کہلاتی ہیں
وقت کا دم کیا ٹوٹ گیا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
سکتے تک اب آ پہنچا ہے بڑھتے بڑھتے کربِ سکوت
ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
کیسی نرمی ، کیسی سختی ، لہجے کی کیا بات کریں
فکر ہی اب گم کردہ صدا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
جب تک راہِ وفا تھی سیدھی زورِ بیاں تھا عیشِ سفر
شاید کوئی موڑ آیا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

پرویز شاہدی

(۱۹۱۰ء - ۱۹۶۸ء)

(۱)

موقعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

کم سے کم میں غمِ دنیا کو بھلا سکتا تھا
پر تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا

اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تُو نے سنورنے نہ دیا

تیری غم خوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
غمِ ہستی کی بلندی سے اُترنے نہ دیا

میں نے دیکھا ہے ترے حسنِ خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا

وہ تری سرخیِ عارض کے قریب آ نہ سکی
رنگ جس فکر کو بھی خونِ جگر نے نہ دیا

حسنِ ہم درد ترا ہم سفرِ شوق رہا
مجھ کو تنہا کسی منزل سے گزرنے نہ دیا

کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہِ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

(۴)

کسی کا خون سہی اک نکھار دے تو دیا
خزاں کو تم نے لباسِ بہار دے تو دیا
اب اور خضر سے کیا چاہتی ہے پیاس مری
سرابِ رحمتِ پروردگار دے تو دیا
بہار آئے نہ آئے مگر لہو نے مرے
چمن کی خاک کو اک اعتبار دے تو دیا
اُمیدیں چھین لیں اس نے تو پھر گلہ کیا ہے
قرار مانگ رہے تھے ، قرار دے تو دیا
جمیلؔ اُس آتشِ رُخ کو ہوا نہ دو اتنی
اب اور چاہیے کیا ، اک شرار دے تو دیا

(۳)

کون فریب کھائے اب فتنۂ رنگ و آب کا
مل گئی تشنگی کو آنکھ ، بجھ گیا دل سراب کا

ایک نگاہِ شوق پر ہو گئے اعتراض سو
خود ہی سوال بن گیا حسن ترے جواب کا

تیری عطا کے تلخ نوش پی کے بنا رہے ہیں منہ
گھول دے اک ذرا سا رس نرگسِ نیم خواب کا

تار بہ بربطِ صفات ، خار بسینۂ حیات
بار بدوشِ کائنات ، راز تری نقاب کا

حسن کہاں کہاں نہ تھا ، پھر بھی نظر جھکی رہی
اُٹھ نہ سکا جمیلؔ سے ناز ترے حجاب کا

(۲)

پرکھ چکا ہے تجھے بارہا شعور مرا
مذاق اُڑا نہ بہت اے حجابِ نور مرا

حقیقتوں کی نمائش کا یہ اُصول غلط
نہ یہ ظہور ہے تیرا، نہ یہ ظہور مرا

ابھی حدودِ تعین میں ہے تلاش تری
ابھی قیودِ عناصر میں ہے شعور مرا

اسی لئے تو دیا ہے یہ خواہشات کا روگ
کہ اعتدال کی حد میں رہے غرور مرا

کیا نہ اس نے خراباتیوں میں میرا شمار
مگر غرور سے آلودہ تھا سرور مرا

قدم قدم پہ ہے ذوقِ نگاہ کی توہین
ترے حجاب سے آزردہ ہے غرور مرا

تھی زندگی کے سفر میں قدم قدم پہ کشش
میں تجھ سے رہ گیا پیچھے یہ ہے قصور مرا

ملا نہ چین تو پھر پھینک کر لباسِ حیات
تری تلاش میں نکلا وجودِ نور مرا

مگر رہے گی ابد تک تلاش اس کی جمیلؔ
بچھڑ گیا تھا ازل میں جو جزوِ نور مرا

جمیل مظہری

(۱۹۰۵ء - ۱۹۵۶ء)

(۱)

بدنام نہ کیوں ہو خم گردن یہ خودی کا
مارا ہے ازل سے تری سجدہ طلبی کا

جھکنا بھی بُرا اور جھکانا بھی بُرا ہے
چوکھٹ سے مٹا داغ مری خیرہ سری کا

کچھ بھی نہ ملا ہاتھ کو کشکول بنا کے
یہ دستِ دعا کاسۂ خالی ہے خودی کا

جلوے ترے بسمل مری افسوں نظری سے
افسوں ترا قائل مری افسانہ گری کا

رہ رہ کے جو بھر آتی ہے، اس آنکھ نے ساقی
بھرتے نہیں دیکھا کبھی پیمانہ کسی کا

نور آنکھوں میں آنا تھا کہ ہونے لگا معدوم
جلوہ کہ کرشمہ تھا مری بے بصری کا

سارے مرے جھگڑے ہیں جمیلؔ اپنے خدا سے
منکر میں آئمہ کا نہ منکر ہوں نبی کا

(۴)

ہم سے فراقؔ اکثر چھپ چھپ کر پہروں پہروں روؤ ہو
وہ بھی کوئی ہمیں جیسا ہے کیا تم اس میں دیکھو ہو
جن کو اتنا یاد کرو ہو چلتے پھرتے سائے تھے
ان کو مٹے تو مدت گزری نام و نشاں کیا پوچھو ہو
جانے بھی دو نام کسی کا آگیا باتوں باتوں میں
ایسی بھی کیا چپ لگ جانا کچھ تو کہو کیا سوچو ہو
کیا غم دوراں کی پرچھائیں تم پر بھی پڑ جائے ہے
کیا یاد آجائے ہے یکایک کیوں اداس ہوجاؤ ہو
ایک شخص کے مر جائے سے کیا ہوجائے ہے لیکن
ہم جیسے کم ہوئیں ہیں پیدا پچھتاؤ گے دیکھو ہو
کچھ تو بتاؤ رنگ روپ بھی تم اس کا اے اہلِ نظر
تم تو اس کو جب دیکھو ہو دیکھتے ہی رہ جاؤ ہو
اکثر گہری سوچ میں ان کو کھویا کھویا پاویں ہیں
اب ہے فراقؔ کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو

(۳)

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

شکوہ جور کرے کیا کوئی اس شوخ سے جو
صاف قائل بھی نہیں صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج میں خاطر بیمار شکیبا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکون دل وحشی کا مقام
کنج زنداں بھی نہیں وسعت صحرا بھی نہیں

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں

(۲)

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکہ ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

کہوں یہ کیسے ادھر دیکھ یا نہ دیکھ ادھر
کہ درد، درد ہے پھر بھی، نظر نظر پھر بھی

خوشا اشارۂ پیہم زہے سکوتِ نظر
دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکشِ جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

ستم کے رنگ ہیں ہر التفاتِ پنہاں میں
کرم نما ہیں ترے جور سر بسر پھر بھی

اگرچہ بے خودیٔ عشق کو زمانہ ہوا
فراقؔ کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

فراقؔ گورکھپوری

(۱۸۹۶ء - ۱۹۸۲ء)

(۱)

زمیں بدلی، فلک بدلا، مذاقِ زندگی بدلا
تمدن کے قدیم اقدار بدلے آدمی بدلا

خدا و اہرمن بدلے وہ ایمانِ دوئی بدلا
حدودِ خیر و شر بدلے مذاقِ کافری بدلا

نئے انسان کا جب دورِ خود آگہی بدلا
رموزِ بےخودی بدلے تقاضائے خودی بدلا

بدلتے جا رہے ہیں ہم بھی دنیا کو بدلنے میں
نہیں بدلی ابھی دنیا تو دنیا کو ابھی بدلا

نئی منزل کے میرِ کارواں بھی اور ہوتے ہیں
پرانے خضرِ رہ بدلے وہ طرزِ رہبری بدلا

کبھی سوچا بھی ہے اے ظلمِ کہنہ کے خداوندو
تمہارا حشر کیا ہوگا جو یہ عالم کبھی بدلا

فراقؔ ہم نوائے میرؔ و غالبؔ، اب نئے نغمے
وہ بزمِ زندگی بدلی وہ رنگِ شاعری بدلا

(۴)

یہ دل ہے یا کوئی پتھر کہ چوٹ ہی نہ لگے — کھری کھری کہو منھ پر تو کیوں بُری نہ لگے
جبھی تک آپ کا خادم ہوں میں تہہ دل سے — کہ اپنے ساتھ کوئی شرط بندگی نہ لگے
کبھی تو آئینہ دیکھو نگاہِ دشمن سے — خدا کرے یہ نصیحت تمھیں کڑی نہ لگے
وطن سے چھوٹ کہ غربت میں دل لگے کیونکر — یہ وہ نہال ہے جس کی قلم کبھی نہ لگے
بدل کے بھیس زمانے کی تھاہ لینا ہے — نگاہ شک میں کوئی بات اجنبی نہ لگے
نکال لینے دو یاروں کو حوصلہ دل کا — دعائے بد بھی کریں وہ تو یاں کبھی نہ لگے
گناہ گار ہوں پھر بھی وہ دل دیا تو نے — تری جناب میں پہنچوں تو تھرتھری نہ لگے

یہی حدیث یگانہ جو تم نے دل سے سنی
زبان غیر سے سنئے تو کچھ بھلی نہ لگے

(۳)

جان پیاری ہے، حیاتِ جاوداں پیاری نہیں
زندگی کیا، موت کی جب گرم بازاری نہیں

صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

جلوہ گر رہنے لگا چشمِ تصور میں کوئی
حضرتِ دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں

دیکھتے ہی دیکھتے بدلا زمانے کا یہ رنگ
پھولوں میں خوشبو، حسینوں میں وفاداری نہیں

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم
کون سی جا ہے، جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں

جھیل لینگے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے، پھر کوئی دشواری نہیں

پھینک دو آئینہ دل کو جو گاہک اُٹھ گئے
اب کہیں بازار میں اس کی خریداری نہیں

درد دل صیاد کو کچھ کچھ سنایا چاہئے
گھٹ کے مر جاؤں تو پھر لطف گرفتاری نہیں

(۲)

گوشہ گیری ہے اک انوکھا سانگ　　مانگتا ہے کھلے خزانے مانگ
پوچھنا کیا زمانہ سازوں کا　　نت نیا بھیس ، نت نرالا سانگ
شیخ کی کون سی ہے کل سیدھی　　ارے جو بات ہے سو اوٹ پٹانگ
کس طلب میں چلا ہے بے اٹکل　　آنکھ والوں سے پہلے آنکھیں مانگ
صلح ٹھہری تو ہے ، برہمن سے　　کہیں مذہب اڑا نہ دے کوئی ٹانگ
خواہ پیالہ ہو ، یا نوالہ ہو　　بن پڑے تو جھپٹ لے، بھیک نہ مانگ

بول بالا رہے یگانہ کا
نام باجے جگت کے چاروں دانگ

یگانہ چنگیزی

(۱۸۸۸ء - ۱۹۵۶ء)

(۱)

دنیا کا چلن ترک کیا بھی نہیں جاتا
اس جادۂ باطل سے پھرا بھی نہیں جاتا

زندانِ مصیبت سے کوئی نکلے تو کیوں کر
رسوا سرِ بازار ہوا بھی نہیں جاتا

دل بعد فنا بھی ہے گراں بار امانت
دنیا سے سبک دوش اُٹھا بھی نہیں جاتا

اک معنی بے لفظ ہے اندیشۂ فردا
جیسے خطِ قسمت کو پڑھا بھی نہیں جاتا

کیوں آنے لگے شاہد عصمت سر بازار
کیوں خاک کے پردے میں چھپا بھی نہیں جاتا

(۴)

یقینِ نامرادی پر بھی حالت ہے وہی دل کی
تمہیں سے چاہتا ہوں داد اپنی سعیِ باطل کی

توجہ کے جو قابل ہو حقیقت کیا مرے دل کی
تری برقِ نظر کو جستجو ہے کس کے حاصل کی

کیا ہے مجھ کو بے حس تو نے اے افسردگی دل کی
نہ غم ہے بُعدِ منزل کا نہ عشرت قربِ منزل کی

کہا کس نے تجھے اے شوق پابندِ ادب ہو جا
یہی آخر ہوا دل میں تمنا رہ گئی دل کی

تلاطم تھا بہت موجیں بہا کر لے گئیں مجھ کو
وگرنہ آرزو تھی کس خرد دشمن کو ساحل کی

مری ہستی کی کیا ہستی مگر اے دیدۂ بینش
ذرا رنگینیاں تو دیکھنا اس نقشِ باطل کی

قدم اُٹھتا ہے بیتابانہ، نظریں بھی پریشاں ہیں
خبر دیتی ہے خود بیتابیِ دل قربِ منزل کی

بچانا چشمِ بد سے اے خدا اس شمعِ محفل کو
نظر پڑتی ہے اُس پر ہر طرف سے اہلِ محفل کی

ہمارا نالۂ موزوں ہے جس کو شعر کہتے ہیں
غزل کی شکل میں ہوتی ہے وحشتِ گفتگو دل کی

(۳)

ہوئے ہیں غم جس کی جستجو میں اسی کی ہم جستجو کریں گے
رکھا ہے محروم جس نے ہم کو اُسی کی ہم آرزو کریں گے
گئے وہ دن جب کہ اس چمن میں ہوائے نشو و نما تھی ہم کو
خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے کہ خواہشِ رنگ و بو کریں گے
حکایتِ آرزو ہے نازک زبان کیا خاک کہہ سکے گی
لبِ خموش و نگاہِ حسرت سے دل کی ہم گفتگو کریں گے
جگہ جو آنکھوں میں میں نے دی تھی تو ان سے تھی چشم رازداری
یہ کیا خبر تھی کہ اشک میرے مجھی کو بے آبرو کریں گے
ابھی تو غم کردہ راہ خود ہیں مئے محبت کی بے خودی میں
اگر کبھی آپ میں ہم جو آئے تو اس کی بھی جستجو کریں گے
اس انجمن میں کہ چشمِ ساقی کفیل ہو عیشِ زندگی کی
وہ بادخواری میں خام ہوں گے جو فکرِ جام و سبو کریں گے
طہارتِ ظاہری سے حاصل نہ ہوسکے گی صفائے باطن
بہائے ہم خونِ توبہ وحشتؔ اُسی سے اک دن وضو کریں گے

(۲)

کسی پر یہ وجودِ کالعدم ہو بار کیا میرا
نہ کوئی التجا میری ، نہ کوئی مدعا میرا
نہ پائی داد کچھ آوارگی کی تیرے وحشی نے
نہ پوچھا ایک دن تو نے کہاں ہے مبتلا میرا
نوائے دردِ تمہیدِ شکستِ سازِ دل نکلی
نشانِ انتہا دیتا ہے رنگِ ابتدا میرا
نہ کہنے کی مجھے عادت نہ سننا خلق کا شیوہ
کوئی جانے تو کیا جانے کہ ہے احوال کیا میرا
فضائے شعر کو پاتا ہوں اب ناآشنا وحشتؔ
نہ کوئی ہم زباں میرا نہ کوئی ہم نوا میرا

وحشت کلکتوی

(۱۸۸۱ء - ۱۹۵۵ء)

(۱)

میں ہی فقط نہ خستۂ دردِ نہاں ہوا　　میرا شریکِ حال مرا رازداں ہوا
صیاد تیرا اس میں بتا کیا زیاں ہوا　　مانا کہ زیرِ دام کوئی پُر فشاں ہوا
دیر و حرم کی قید نہ تھی راہِ شوق میں　　میں نے نمازِ عشق ادا کی جہاں ہوا
منزل نما تھیں میرے لئے سب رکاوٹیں　　ہر سنگِ راہ مجھ کو ترا آستاں ہوا
بیرونِ دل گیا نہ کبھی حالِ دردِ دل　　خود نالہ محوِ لذتِ سوزِ نہاں ہوا
فکرِ خدا غرور سے میں پاک ہوگیا　　جو نازِ زہد تھا وہ نیازِ بتاں ہوا
کیوں لوگ نکتہ چینی پہ آمادہ ہوگئے
وحشت مجھے کمال کا دعویٰ کہاں ہوا

(۴)

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

جلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری
تری تمکینِ بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

جفائے یار کے شکوے نہ کر اے رنج ناکامی
امید و یاس دونوں ہوں بہم ایسا بھی ہوتا ہے

وقار صبر کھویا گریۂ ہائے بے قراری نے
کہیں اے اعتبارِ چشمِ نم ایسا بھی ہوتا ہے

یہ دعوائے وفا کیوں شکوہ سنج جور ہے حسرت
دیارِ شوق میں اے محوِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

(۳)

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی شیدائی نہ تھا
باوجود حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں یہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں یہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جبکہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا
تو نے حسرتؔ کی عیاں تہذیب رسمِ عاشقی
ورنہ پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

(۲)

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے ناز بے جا کر دیا

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا ، قطرے کو دریا کر دیا

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منوّر جان و دل
شمع جب روشن ہوئی گھر میں اُجالا کر دیا

تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرتؔ اور دو نا کر دیا

حسرت موہانی

(۱۸۷۸ء - ۱۹۵۱ء)

(۱)

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لئے ہیں چلن تمام

اللہ ری جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دل خون ہو چکا ہے جگر ہو چکا ہے چاک
باقی ہوں میں مجھے بھی کرائے تیغ زن تمام

دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں
ہے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

ہے نازِ حسن سے جو فروزاں جبیں یار
لبریز آبِ نور ہے چاہِ زقن تمام

نشو و نمائے سبزہ و گل سے بہار میں
شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام
گل زار ہو گیا ہے زمینِ دکن تمام

اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حب وطن تمام

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریب مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

(۱۱)

نہ میں عجمی ، نہ ہندی ، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دوجہاں سے بے نیازی!
تو مری نظر میں کافر ، میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری ، مرا دیں نفس گدازی!
تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ تدرواں نہیں دینِ شاہبازی!
ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسم کارسازی!
نہ جدا رہے اگر تو تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکیِ اُمم ہے یہ طریق نے نوازی!

(۱۰)

تیری متاعِ حیات ، علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات ، ایک دلِ ناصبور!
معجزۂ اہلِ فکر ، فلسفۂ پیچ پیچ
معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰ و فرعون و طور
مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں ، گرمیِ یوم النشور!
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں ! میرے جنوں کا قصور!
فیضِ نظر کے لئے ضبطِ سخن چاہیے!
حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور
خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور!

(۹)

گیسوے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!

عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

تو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر!

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر!

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر!

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر!

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرم سار ہو، مجھ کو بھی شرم سار کر!

(۸)

اگر کج رو ہیں انجم ، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو ، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر؟
مجھے معلوم کیا! وہ راز داں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا ، جبریل بھی ، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

(۷)

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں!
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں!
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں!
گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو اک راز تھا سینۂ کائنات میں!

(۶)

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے ، گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا ، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا!

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی ، غبار تھا کوئے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے ، دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گل چیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بے درد کیوں ہے انساں؟
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوا پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے ، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے ، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجکو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ ، مجاز رختِ سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

جو گھر سے اقبالؔ دور ہوں میں، تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا!

(۵)

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے
ملا محبت کا سوز مجکو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے
یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل!
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے
نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے
مدیرِ مخزن سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

(۴)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجران فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبالؔ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

(۳)

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضائے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
کہہ گئیں رازِ محبت پردہ دارِ بیہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

(۲)

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
نہ کر دیں مجھ کو مجبور نوا فردوس میں حوریں
مرا سوز دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے
بتایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہ داری مرا ساحل نہ بن جائے
کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

علامہ اقبالؔ

(۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸ء)

(۱)

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرسودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناریٔ بت خانۂ ایام ابھی

عذر پر ہیر یہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

ابر نیساں یہ تنک بخشیٔ شبنم کب تک؟
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مئے آشام ابھی

خیر اقبالؔ کی لاتی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہہ دام ابھی

(۴)

دیکھے گئے نہ جور و ستم آسمان کے
گوشے میں ہم بھی پڑ رہے چادر کو تان کے

مشتاقِ وصل جان سے جاتا ہے اک غریب
آؤ اگر خلاف نہ ہو اپنی شان کے

شکوہ ہے بلبلوں کو قفس میں بہار کا
لالے پڑے ہیں آپ یہاں اپنی جان کے

افسوس ہے یہاں بھی نہ پایا درِ مراد
روح آئی تھی عدم میں بہت خاک چھان کے

گذری ستم کشوں پہ جو گذری فراق میں
خیر اب وہ بات بھی نہیں قابل بیان کے

آیا دلِ شکستہ میں اپنے خیالِ وصل
اللہ رے نصیب اس اُجڑے مکان کے

اے شادؔ سیر گاہ تھی اپنی فضائے محض
عادی نہ تھے ہم ایسے بھیانک مکان کے

(۳)

ڈھونڈھو گے اگر ملکوں ملکوں ، ملنے کے نہیں ، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم ، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے ، آ ، کچھ بھی نہیں ، پایاب ہیں ہم
اے درد پتہ کچھ تو ہی بتا ، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بے تاب بتاں یا آپ دلِ بے تاب ہیں ہم
اے ضعف تڑپتے جی بھر کر ، تو نے مری مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پر ہو چڑھا ، سیماب بھی وہ سحاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں ، کم یاب ہیں ہم
ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں ، پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے
اب دردِ جدائی سے ان کے ، اے آہ بہت بے تاب ہیں ہم
اے شوق بُرا اس فہم کا ہو ، مکتوب تمام اپنا نہ ہوا
واں چہرے پہ ان کے خط نکلا ، یاں بھولے ہوئے القاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے ، اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

(۲)

خدا جانے سنا کانوں نے کیا آنکھوں نے کیا دیکھا
ترے جلوے کے آگے ہوش کب اپنا بجا دیکھا

یہی ہے ہر ہی معنی میں معنی ہی ہمدردیوں کے ہیں
مصیبت میں ہمیشہ ہوش کو دل سے جدا دیکھا

نہ دردِ دل گیا اپنا بہت دن صبر میں کاٹے
بہت اشکوں کا دریا بھی ان آنکھوں سے بہا دیکھا

نگاہوں میں تو اپنی یار تیرا پاک نقشہ تھا
قسم لے گر کسی کو آنکھ نے تیرے سوا دیکھا

بڑی اُمید تھی ، لیکن نہ پایا مر کے بھی تجھ کو
یہ پردہ بیچ میں حائل جو تھا یہ بھی اُٹھا دیکھا

کبھی کی اپنی آزادی جو یاد آئی بہت روئے
کسی بد مست کو گر راہ میں ہم نے پڑا دیکھا

ہوس باقی نہیں ہے بیش و کم کو آزما دیکھا
دلِ مضطر کو ہم نے ، دل نے ہم کو آزما دیکھا

ضرورت پیش کی جا جا کے اکثر بے ضرورت بھی
اسی پردے میں اربابِ کرم کو آزما دیکھا

خراباتِ مغاں کی مجلسوں کا شادؔ کیا کہنا
انہیں حلقہ نشینوں کو قطعاً اک بے ریا دیکھا

شاد عظیم آبادی

(۱۸۴۶ء - ۱۹۲۷ء)

(۱)

زیست ہے نام تیری فرقت کا
کچھ ٹھکانہ ہے اس مصیبت کا

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
پاؤں پھیلا ہماری وحشت کا

حشر سے آرہے گلی میں تری
منھ بھی دیکھا نہ ہم نے جنّت کا

کس کو صبحِ وطن کی یاد آئی
رنگ کیوں فق ہے شامِ غربت کا

باغِ جنّت ہے گلشنِ دنیا
پھول کھلتا ہے تیری رنگت کا

زندگی بھی لقب اسی کا ہے
نام مرنا بھی ہے محبت کا

بے نشانی نشاں بنا دے گی
وہ نشاں تک مٹائیں تربت کا

شرحِ احوال کرسکوں کیوں کر
حشر کل ایک دن ہے مہلت کا

زردیٔ رُخ کی وجہ کیا کہیے
یہ بھی اک رنگ ہے طبیعت کا

ہم بھی سوئیں گے اے شبِ ہجراں
وقت آتا ہے اپنی فرصت کا

اس کی قسمت میں کب ہے آزادی
بندہ ہے آدمی ضرورت کا

اپنی حیرت پر اس قدر حیرت
یہ سبب اور بھی ہے حیرت کا

سوتے ہیں چین سے شہید ترے
قبر میں در کھلا ہے جنّت کا

عیش و عشرت کے دن سدھار گئے
اب میں پتلا ہوں شادؔ حسرت کا

(۲)

یاں خضر بھی از جملۂ گم کردہ رہاں ہے
معلوم نہیں منزلِ دلدار کہاں ہے
آمد ھدِ عالم کو جو دیکھا بہ تامّل
اک شیشۂ ساعت ہے کہ ریگ اس میں رواں ہے
ہے بزم کسی کے رُخِ پُرنور کا جلوہ
جو شمع کی انگشتِ تحیر بہ دہاں ہے

قاضی محمد صادق خاں اختر

(۱)

غافل احوالِ جہانِ گذراں کیا جانے
گُل تصویر بھلا فصلِ خزاں کیا جانے
چشمِ فانی کو نہیں رتبۂ جاں کچھ معلوم
منزلت آئینہ کی آئینہ داں کیا جانے
امتحاں سے نہ ہوا کیجئے اختر پہ خفا
نو گرفتار ہے وہ لطفِ نہاں کیا جانے

(۴)

نہ میں زمیں کے لئے ہوں نہ میں زماں کے لئے
ہوا ہوں خلق فقط جورِ آسماں کے لئے
رکھا نشان بھی گل کا نہ باغ میں باقی
قدم بھی بلبلِ دل خستہ نے خزاں کے لئے
ذرا تو دیکھیو شوقِ اسیریٔ بلبل
قفس کی تیلیاں چن لائی آشیاں کے لئے
اثر کا حال نہ پوچھو کہ میرے نالوں سے
ستارے اور بنے زیبِ آسماں کے لئے
وہ بے نصیب ہوں اے ہم صفیر گر ڈھونڈوں
تو خار تک بھی نہ ہاتھ آئے آشیاں کے لئے

(۳)

گزرتا ہوں جو میں کوئے بتاں میں
کھٹکتا ہوں نگاہِ پاسباں میں
اثر واں کچھ نہ ہو یاں جل بجھے دل
لگاؤ آگ اس سوزِ نہاں میں
اِدھر کیوں ہے نگاہِ تیز اے برق
دھرا ہے کیا ہمارے آشیاں میں
وہ جو کہتے ہیں ، کہتا ہوں وہی میں
زبانِ یار ہے گویاں دہاں میں
کہے ناسخ نے وہ شعرِ اردو
کہ جن کی دھوم ہے ہندوستاں میں

(۲)

رکھتے ہیں اس بت کو ہم جاں سے عزیز
جان کیسی دین و ایماں سے عزیز

جوشِ وحشت میں ہم اے دستِ جنوں
چاک کو رکھتے ہیں داماں سے عزیز

میرے حق میں یار کی جھوٹی شراب
ساقیا ہے آبِ حیواں سے عزیز

مجھ کو وہ شوقِ شہادت ہے کہ ہے
تیغ کا ڈورا رگِ جاں سے عزیز

وہ کبھی عاشق نہیں ہے بوالہوس
جان کو رکھے جو جاناں سے عزیز

ہوں میں اے نساخ ایسا زخم دوست
درد کو رکھتا ہوں درماں سے عزیز

عبدالغفور خاں نساخ

(۱۸۳۴ء - ۱۸۸۹ء)

(۱)

جب تک کہ حالِ زار پہ وہ مہرباں نہ تھا
لب پر ہمارے نالہ و شور و فغاں نہ تھا
اب تک اسی کی فکر میں ہے دل کو اضطراب
کل رات کوئے یار میں کیوں پاسباں نہ تھا
میں چپ تھا اور پوچھتے تھے حالِ عشق وہ
میرا سکوت ایک طرح کا بیاں نہ تھا
کل رات میکدے سے گیا گھر رقیب کے
سائے کی طرح ساتھ ترے میں کہاں نہ تھا

(۴)

جب کہا اور بھی دنیا میں حسیں اچھے ہیں
کیا ہی جھنجھلا کے وہ بولے کہ ہمیں اچھے ہیں

نہ اُٹھا خواب عدم سے ہمیں ہنگامۂ حشر
کہ پڑے چین سے ہم زیرِ زمیں اچھے ہیں

کس بھروسے پہ کریں تجھ سے وفا کی اُمید
کون سے ڈھنگ ترے جانِ حزیں اچھے ہیں

خاک میں آہ ملا کر ہمیں کیا پوچھتے ہو
خیر جس طور ہیں ہم خاک نشیں اچھے ہیں

ہم کو کوچے سے تمہارے نہ اُٹھائے اللہ
صدقے بس خلد کے کچھ ہم تو یہیں اچھے ہیں

نہ ملا خاک میں تو ورنہ پشیماں ہوگا
ظلم سہنے کو ہم اے چرخِ بریں اچھے ہیں

دل میں کیا خاک جگہ دوں ترے ارمانوں کو
کہ مکاں ہے یہ خراب اور مکیں اچھے ہیں

مجھ کو کہتے ہیں رقیبوں کی برائی سن کر
وہ نہیں تم سے برے بلکہ کہیں اچھے ہیں

بت وہ کافر ہیں کہ اے داغؔ خدا ان سے بچائے
کون کہتا ہے یہ غارت گر دیں اچھے ہیں

(۳)

سوز و گداز عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانند آبلہ ہمہ تن آب دیدہ ہوں

سرو سہی ہوں اور نہ شاخ خمیدہ ہوں
تسلیم و راستی کے لئے آفریدہ ہوں

گر تو نہ ہو تو پھر کسی کافر کا دل لگے
دوزخ میں آرمیدہ ارم میں رمیدہ ہوں

نازک مزاجیوں نے مجھے تجھ سا کر دیا
اے بے خبر میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں

اللہ رے کشاکش ، دیر و حرم کہ میں
ظالم ہزار ہاتھ سے دامن دریدہ ہوں

پروانہ پاس شمع کہ بلبل ہے گل کے پاس
اک میں کہ تیری بزم میں خلوت گزیدہ ہوں

بیتاب درد ہوں تو دل رازدار ہوں
لبریز شکوہ ہوں تو زبان بریدہ ہوں

افتادگی پہ بھی نہ گئی اس کی جستجو
گویا زمیں پہ سایۂ مرغ پریدہ ہوں

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق دوست تمنا بریدہ ہوں

صیاد پر ہوں بار تو ہوں باغباں کو خار
آزاد دام و تا بہ چمن نارسیدہ ہوں

اے داغؔ جس کے واسطے روز جزا بنا
وہ کون ہے وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

(۲)

ملتے ہی بیباک تھی وہ آنکھ شرماتی ہوئی
پھر گئی پچھتا کے پلکوں تک حیا آتی ہوئی

ہائے وہ دنیا کہاں وہ عیب پوشی اب کہاں
عرصۂ محشر میں رسوائی سی رسوائی ہوئی

مجھ کو یہ دعویٰ کوئی تیرے سوا دل میں نہیں
اس کا یہ الزام ، اچھی قید تنہائی ہوئی

ٹوک کر رستے میں پیار آ ہی گیا اس شوخ پر
وہ نظر حیرت زدہ وہ آنکھ شرمائی ہوئی

تازہ غم کھایا کئے ہم وہ ہیں پاکیزہ مزاج
اور تم کھاتے رہے جھوٹی قسم کھاتی ہوئی

بھولے بن کر ان کے منہ سے سن لیا حال رقیب
عمر بھر میں ایک ہی تو ہم سے دانائی ہوئی

چوٹ کھائی عشق کی دل نے ، جگر تڑپا کیا
دوسرے پر آتی کیونکر ایک کی آئی ہوئی

توبہ کر زاہد کروں میں میں توبہ ایسے وقت میں
یہ بہار آئی ہوئی ، ایسی گھٹا چھائی ہوئی

یہ ملا ذکر قیامت پر قیامت کا جواب
کیا اُٹھے گی وہ ہماری ٹھوکریں کھائی ہوئی

ہے عجب اندھیر کوئی داغ کا پرساں نہیں
صبح محشر بھی الٰہی شام تنہائی ہوئی

داغ دہلوی

(۱۸۳۱ء - ۱۹۰۵ء)

(۱)

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں، کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

ڈرتا ہوں دیکھ کر دلِ بے آرزو کو میں
سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو مہمان تو گیا

کیا آئی راحت آئے جو کنجِ مزار میں
وہ ولولہ، وہ شوق، وہ ارمان تو گیا

دیکھا ہے بت کدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر
مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

بزمِ عدو میں صورتِ پروانہ دل مرا
گو اشک سے جلد ترے قربان تو گیا

ہوش حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

(۴)

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے　　کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
رشک پیغام ہے عناں کش دل　　نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ　　غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے
ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں　　زندگی پردہ در نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم　　کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغییر رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
میرے آنسو نہ پوچھنا دیکھو　　کہیں دامان تر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں　　کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
اے قیامت نہ آئیو جب تک　　وہ مری گور پر نہ ہو جائے
مانعِ ظلم ہے تغافلِ یار　　بخت بد کو خبر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو　　شبِ عاشق سحر نہ ہو جائے
رشک دشمن کا فائدہ معلوم　　مفت جی کا ضرر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہ تاب شکن　　دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے

مومنؔ ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

(۳)

جاتے تھے صبح رہ گئے بیتاب دیکھ کر
طالع ہمارے چونک پڑے خواب دیکھ کر

پایا جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار
آنکھیں چراتے ہیں مجھے احباب دیکھ کر

یہ تشنہ کامیِ نگہِ گرم دیکھنا
حسرت سے رو دیا طرفِ آب دیکھ کر

توبہ کہاں کدورتِ باطن کے ہوش تھے
غش ہو گیا میں رنگ مے ناب دیکھ کر

اُٹھی نہ نعش بھی ترے کوچہ سے بعد قتل
ہم رہ پڑے زمین کو شاداب دیکھ کر

روئے وہ میرے حال پہ حیران کیوں نہ ہوں
آنکھیں سی کھل گئیں دُرِ نایاب دیکھ کر

شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر
سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھ کر

ہے ہے تمیز عشق و ہوس آج تک نہیں
وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر

مومنؔ یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

(۲)

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالعِ دیدار دیکھنا

بد کام کا مآل بُرا ہے جزا کے دن
حالِ سپہرِ تفرقہ انداز دیکھنا

مت رکھیو گرد تارکِ عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جاوے سرافراز دیکھنا

کشتہ ہوں اُس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوے اعجاز دیکھنا

میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے
مومنؔ غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

مومن خاں مومنؔ

(۱۸۰۰ء - ۱۸۵۱ء)

(۱)

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا
تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

کچھ قفس میں اِن دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں
حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا

ہیں اسیر اُس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا صیّاد کیا

شوخ بازاری تھی شیریں بھی مگر
ورنہ فرقِ خسرو و فرہاد کیا

نشۂ اُلفت سے بھولے یار کو
سچ ہے ایسی بے خودی میں یاد کیا

نالہ اک دم میں اُڑا ڈالے دھویں
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

جب مجھے رنجِ دلِ آزاری نہ ہو
بے وفا پھر حاصلِ بے داد کیا

پانوں تک پہنچی وہ زلفِ خم بخم
سرو کو اب باندھیے آزاد کیا

کیا کروں اللہ ہیں سب بے اثر
ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا

دل رُبائی زلفِ جاناں کی نہیں
پیچ و تابِ طرۂ شمشاد کیا

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

روزِ محشر کی توقع ہے عبث
ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا

گر بہائے خونِ عاشق ہے وصال
انتقامِ زحمتِ جلاد کیا

بت کدہ جنت ہے چلئے بے ہراس
لب پہ مومنؔ ہر چہ بادا باد کیا

(۴)

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تیری تندیٔ خو، جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پانو اُٹھ گئے وہی ان کے علَم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

(۳)

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی، ہمارے جَیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں
طاقت بہ قدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سَر وَبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

(۲)

سب کہاں کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو انکے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو، نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں و فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے، راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

(۱۷۹۶ء - ۱۸۶۹ء)

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ، ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی ، نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا ، لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی ، دامِ شنیدن ، جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بس کہ ہوں ، غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۴)

عدم سے جانبِ ہستی تلاشِ یار میں آئے
ہوائے گل میں ہم کس وادیٔ پُر خار میں آئے

کمندوں سے نہیں کم سبحۂ زنار کے حلقے
پھنسے وہ جو فریبِ کافرو دیں دار میں آئے

خریداروں میں عاشق اپنے ناموں کو ہیں لکھواتے
تماشا ہے وہ یوسف بن کے ہیں بازار میں آئے

رہا اے بادشاہِ حسن تو جس قصرِ عالی میں
ہما بہرِ سعادت سایۂ دیوار میں آئے

گئے جس بزم میں روشن چراغِ حسن سے کر دی
بہارِ تازہ آئی تم اگر گل زار میں آئے

کیا ہے حسن نے سلطانِ خوباں چاہیے تم کو
ملے دادان کی فریادی جو ہیں سرکار میں آئے

بجا کرتے ہیں نحوی احتمالِ صدق و کذب آتش
بہت سے مختلف احوال بھی اخبار میں آئے

(۳)

ہوائے دور مئے خوش گوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

سمندِ عشق کو اللہ رے شوق آسایش
عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

تلاش یار میں کیا ڈھونڈیے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

کوئی تو دوش سے بار سفر اُتارے گا
ہزار راہ زن امیدوار راہ میں ہے

بلائے جان مسافر ہے خواب شیریں بھی
یہی وہ شہد ہے جو زہر مار راہ میں ہے

پتا یہ کوچۂ قاتل کا سن رکھ اے قاصد
بجائے سنگ نشاں اک مزار راہ میں ہے

چلا ہے تیر و کماں لے کے صید گاہ وہ ترک
خوشا نصیب وہ جو جو شکار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

(۲)

وحشتِ دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
سیکڑوں کوس نہیں صورتِ انساں پیدا

سحرِ وصل کرے گی شبِ ہجراں پیدا
صُلبِ کافر ہی سے ہوتا ہے مسلماں پیدا

دل کے آئینہ میں کر جوہرِ پنہاں پیدا
در و دیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا

خار دامن سے الجھتے ہیں بہار آئی ہے
چاک کرنے کو کیا گُل نے گریباں پیدا

نسبت اس دستِ نگاریں سے نہیں کچھ اس کو
یہ کلائی تو کرے پنجۂ مرجاں پیدا

نشۂ مئے میں کھلی دشمنیٔ دوست مجھے
آبِ انگور نے کی آتشِ پنہاں پیدا

باغ سنسان نہ کر ان کو پکڑ کر صیّاد
بعد مدت ہوئے ہیں مرغِ خوش الحاں پیدا

اب قدم سے ہے مرے خانۂ زنجیر آباد
مجھ کو وحشت نے کیا سلسلہ جنباں پیدا

موجد اس کی ہے سیہ روزی یہ اس کی آتش
ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شبِ ہجراں پیدا

خواجہ حیدر علی آتش

(۱۷۷۸ء - ۱۸۴۶ء)

(۱)

توڑ کر تار نگہہ کا سلسلہ جاتا رہا
خاک ڈال آنکھوں میں میری قافلہ جاتا رہا

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامانِ یار
کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا

خار صحرا پر کسی نے تہمت دزدی نہ کی
پاؤں کا مجنوں کے کیا کیا آبلہ جاتا رہا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

جب اُٹھایا پاؤں آتش مثل آواز جرس
کوسوں پیچھے چھوڑ کر میں قافلہ جاتا رہا

(۴)

کیوں چوٹ دل میں اپنے اتنی لگی ہوئی ہے
کیا بددعا کسی کی کوئی لگی ہوئی ہے
تعذیب گر نہیں ہے کچھ جرمِ عشق پر تو
قمری کے کیوں گلے میں پھانسی لگی ہوئی ہے
ہوگی قبائے ہستی اتنی مری پرانی
داغوں کی جس میں سو جا تھگلی لگی ہوئی ہے
جس طرح نوکِ نشتر رہ جائے ٹوٹ کر کوئی
رگ رگ میں پھانسی غم کی ایسی لگی ہوئی ہے
میری لگی ہوئی کو جانے طپش وہی کچھ
جس کے کہ آپ دل میں کچھ بھی لگی ہوئی ہے

(۳)

دنیا تمام بس کہ ہے مانند خواب کی
دریا کو بھی نمود ہے اک دن سراب کی
شکل ایک سی رہی دل پُراضطراب کی
تاثیر یاں نہ دہر کے ہوئی انقلاب کی
سمجھو اگر مظاہرِ اشیا بغور تو
ہر ذرّہ میں جھلک ہے اسی اضطراب کی
شکلِ حباب آنکھ سے پردہ اُٹھے اگر
تو بیچ میں نہ بات رہے پھر حجاب کی
ہے کشتیِ شکستہ کی مانند اے طپش
صورت کچھ ان دنوں مری چشمِ پُرآب کی

(۲)

فغاں لب پر، سرشک آنکھوں پہ، نالہ دل میں رہتا ہے
رہا جو ہر محبت کا سو آب و گِل میں رہتا ہے

لکیریں صفحۂ اعمال پر کھینچی ہیں یوں ہم نے
دیوانہ جیسے کوئی مشقِ خط باطل میں رہتا ہے

پس از تحقیق مسکن اشکِ خونیں کا کھلا ہم پر
کہ یہ قطرہ مصیبت کا رگِ بسمل میں رہتا ہے

اچنبھا ہے کہ داغِ دل مرا دیکھے نہ تو ورنہ
خیال اہلِ کرم کا کاسۂ سائل میں رہتا ہے

طپش خاکسترِ دل سے خمیرِ برق ہوتا ہے
کہ اس برقِ نگہ کا نت تخیل دل میں رہتا ہے

مرزا جان طپش

(۱۷۶۹ء - ۱۸۱۷ء)

(۱)

الم سے، درد سے، خونِ جگر سے، یاس سے، غم سے
مجسم ہو کے قطرہ آج ٹپکے چشمِ پُر نم سے

زہے دستِ قضا کا بھی کمالِ صنع پردازی
بنایا جس نے پتلا درد کا یوں خاکِ آدم سے

بغیر از اشکِ تر شاداب کس سے ہووے داغِ دل
کہ گل کے واسطے تزئین کیا بہتر ہے شبنم سے

پڑیں پتھر تری فہمید پر اے معمِ غافل
کہ استحکام اپنا سمجھے ہے اس قصرِ محکم سے

طپش نے مہر کی اس واسطے مکتوب پر اپنے
کہ ہے تشبیہ چشمِ منتظر کو نقشِ خاتم سے

(۴)

بھری وہ آتشِ عشق اس دلِ فگار میں ہے
کہ لاکھ برق نہاں جس کے ہر شرار میں ہے
کسی نے اس کی شکایت جو کی تو میں بولا
وہ کیوں نہ جبر کرے؟ کس کے اختیار میں ہے
سوائے آپ کے یاں کون پوچھے عاشق کو
وہ کس شمار میں ہے کون سی قطار میں ہے
یہ کون پھوٹ کے رویا کہ درد کی آواز
رچی ہوئی جو پہاڑوں کے آبشار میں ہے
کدھر سے آتی ہے آوازِ دوست اے مطرب
نہ نطق انگلیوں میں ہے نہ چوب و تار میں ہے
بہم نہ ملنے کے شکوے عبث ہیں آپس میں
ہر ایک شخص لگا اپنے کاروبار میں ہے

(۲)

رونا ہی تھا یہ موجبِ افشائے رازِ عشق
یہ مردمانِ چشم مجھے تو ڈبو چکے

تابِ تحمل شبِ ہجراں نہیں مجھے
تم مشفق ، ایک بار بھلا دیکھ تو چکے

پھر جان بوجھ کہتے ہو جاتا ہوں ، جایئے
تشریف لے سدھاریے ہم دل کو رو چکے

جس دن سے تم سے آنکھ لڑی ، اشکِ چشم سے
ہاتھ اپنے ہم تو دیدہ و دانستہ دھو چکے

واللہ میں بھی تنگ ہوں اب کاش ، اے صنم
جو کچھ نصیب میں ہو کہیں جلد ہو چکے

غیروں سے بات چیت ہے میرے ہی سامنے
یہ حال ہے ، تو خیر ، مجھے آپ کھو چکے

خوابِ عدم سے شورِ جنوں نے جگا دیا
انشا بس اور نیند کہاں ، خوب سو چکے

انشاء اللہ خان انشاؔ

(۱۷۵۶ء - ۱۸۱۷ء)

(۱)

کوئی اس دامِ محبت میں گرفتار نہ ہو
اے خدا یہ تو کسی بندے کو آزار نہ ہو

اس کے ملنے سے گرانی ہی پھر آجاتی ہے
نکہت گل کی طرح سے جو سبک بار نہ ہو

سیر تو ایک طرف لاکھ غنیمت کہ یہاں
سانس لینے میں کوئی شخص گنہ گار نہ ہو

چاہیے کچھ خریداری اسی جنس کی اب
جس کی مطلق کہیں کچھ گرمیِ بازار نہ ہو

آج ہے دھوم اسیرانِ قفس میں کچھ اور
جا کے دیکھو تو، کوئی تازہ گرفتار نہ ہو

بختِ بیدار اگر خواب میں تجھ کو پاوے
تو وہ پھر تا بہ قیامت کبھی بیدار نہ ہو

(۴)

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے
دیکھو تو تہِ نقاب کیا ہے
میں نے تجھ کو تو نے مجھ کو دیکھا
اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے
آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو
اے قبلہ! یہ اضطراب کیا ہے
اس بن ہمیں جاگتے ہی گزری
جانا بھی نہ یہ کہ خواب کیا ہے
مجھ کو بھی گنے وہ عاشقوں میں
اس بات کا سو حساب کیا ہے
سیپارۂ دل کو دیکھ اس نے
پوچھا بھی نہ یہ کتاب کیا ہے
اس میکدۂ جہاں میں یارو
مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے
قسمت میں ہماری مصحفی ہائے
کیا جانے ثواب و عذاب کیا ہے

(۳)

ہماری طرف آپ کم دیکھتے ہیں
وہ آنکھیں نہیں اب جو ہم دیکھتے ہیں

تو آوے نہ اوے ولے ہم تو ہر شب
تری راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں

بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے
بھلا یہ بھی تیری قسم دیکھتے ہیں

ہمیں جستجو کس کی در پیش آئی؟
عرب ڈھونڈتے ہیں عجم دیکھتے ہیں

بہت دیکھا دنیا کو جاتے ہیں یارو
یہی خط نویسی ہے مردم کی اس کو

تو ہاتھ اپنے اک دن قلم دیکھتے ہیں
ذرا اب تو ملک عدم دیکھتے ہیں

بھروسا ہے کیا دم کا یعنی کہ ہاں کی
ہوا مختلف دم بہ دم دیکھتے ہیں

پڑے ہے نظر عیب ہی پر انہوں کی
ہنر مصحفی یار کم دیکھتے ہیں

(۲)

اک حرف کن میں جس نے کون و مکاں بنایا
اے جانِ خلق تجھ کو جانِ جہاں بنایا
اپنی تو اس چمن میں عمر اس طرح سے گذری
یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا
گرم سفر رہے پر منزل کو ہم نہ پہنچے
آوارگی نے ہم کو ریگ رواں بنایا
اے مصحفی گریباں سارا لہو سے تر ہے
یہ رنگ اپنا ظالم تو نے کہاں بنایا

غلام ہمدانی مصحفی

(۱۷۵۰ء - ۱۸۲۴ء)

(۱)

تجھ سے گروہ دلا نہیں ملتا زہر بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا
اور سب کچھ جہاں میں ملتا ہے لیکن ایک آشنا نہیں ملتا
شیخ کعبے اُٹھ نکل باہر گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا
دل دیوانہ رات سے گم ہے کہیں اس کا پتہ نہیں ملتا
درد و غم کو بھی مقدر شرط یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا
کشتۂ خنجر تغافل کو حشر تک خون بہا نہیں ملتا
بے نمک چھڑکے زخم پر اپنے ہم کو کچھ بھی مزا نہیں ملتا
فہم اگر ہو مجھے غنیمت جان عاشق باوفا نہیں ملتا
جب پوچھا کہ مصحفی سے بھلا ق کیوں تو اے بے وفا نہیں ملتا
ہنس کے بولا کہ او میاں اس سے
کیا کروں دل مرا نہیں ملتا

(۴)

بسمل ادائے شکر اے جلاد کیا کرے
جس کے ہو منہ پہ ہاتھ سو فریاد کیا کرے
آئی بہار گو کہ اے صیاد مجھ کو کیا
بے بال و پر قفس سے ہو آزاد کیا کرے
یک مشت خاک ہو گئی ہے شوق میں ترے
قمری زیادہ اس سے اے شمشاد کیا کرے
بیچا ہے دل کو اپنے میں ظالم کے ہاتھ میں
اب دیکھئے وہ میرے پہ بیداد کیا کرے
نے گل نہ ساقی اور نہیں ملتی شراب ہے
مخلص بہار میں کوئی دلشاد کیا کرے

(۳)

یارو اللہ سا دلدار کہیں دیکھا ہے
دوست و دشمن کا جو ہو یار کہیں دیکھا ہے
ہائے کرتا ہے عبث مجھ کو نصیحت ناصح
عشق کے مست کو ہشیار کہیں دیکھا ہے
یوسفِ دل کو بغل میں جو لئے پھرتے ہو
کیا زلیخا سا خریدار کہیں دیکھا ہے
آنکھ نرگس نے خجالت سے جو کی ہے نیچی
شاید اس چشم کا بیمار کہیں دیکھا ہے
دیکھ تو تجھ کو کسی حال نہ چھوڑا ان نے
تو نے مخلص سا وفادار کہیں دیکھا ہے

(۲)

مجلس سے روتی شمع نہ وقت سحر گئی
بلبل بھی آہ باغ سے با چشمِ تر گئی

تنہا کبھی نہ عشق میں پروانہ ہی جلا
الفت میں اس کی شمع بھی کیا کچھ نہ کر گئی

گل نے بھی اپنا رو کے گریباں کیا ہے چاک
بلبل کے مرنے کی اُسے جس دم خبر گئی

میں تو اسی طرح سے تری بندگی میں ہوں
ظالم وہ چاہ تیری نہ جانوں کدھر گئی

مخلص نے اس قدر جو ترے عشق میں کیا
ہرگز نہ اس پہ میر کی تیری نظر گئی

مخلص مرشد آبادی

(۳۰-۱۷۴۰ء - ۱۷۹۲ء)

(۱)

صنم کے دل کو مری آہ و نالہ آب کرے
خدا دعا یہ مری روز مستجاب کرے
اسیر کر کے قفس میں بھلا دیا ہم کو
تمہارے ظلم کا کیا کیا کوئی حساب کرے
پھرے نہ تجھ سیتی ہرگز کبھی یہ دل میرا
ہزار بار جہاں گو کہ انقلاب کرے
سنا ہے تُو نے اے مخلص جو مجھ پہ گذرا کل
اگر میں تجھ سے کہوں مجھ پہ تو عتاب کرے
کہا تب ان نے کہ میں نے تجھے نہیں دیکھا
تمام عمر جو اس طرح اضطراب کرے

(۴)

نہ واقف کاروں سے ہوں نہ کچھ آگاہ منزل سے
کیا میں وادیٔ الفت کو طے یک جنبشِ دل سے
کرے تو ذبح جب تک اور کو یہ مفت مرتا ہے
نہ ہو غافل ارے صیّاد صیدِ نیم بسمل سے
گئے وہ دن کہ بہتے تھے بڑے پانی ان آنکھوں سے
سرِ مژگاں تلک اک اشک اب آتا ہے مشکل سے
ہے گردابِ بلا از بسکہ سرگرم ہم آغوشی
رکھے ہے بادباں کشتی مری دامانِ ساحل سے
جو کچھ عرصہ ہے محشر کا وہ ہے معلوم قدرت کو
حسابِ کشتگاں یارب چکے گا کیونکہ قاتل سے

(۳)

جانِ حسرت کش پر اے جاں سخت دار و گیر ہے
جو دم اب نکلے ہے تجھ بن سو دمِ شمشیر ہے
کب نسیم دلکشائے صبح سے یاں ہو سکے
یہ دلِ افسردہ اپنا غنچۂ تصویر ہے
ہم سبک روحوں کو کب ہے قافلہ کا انتظار
مثلِ بو دوشِ صبا پر اپنی جب شب گیر ہے
خضر کی آبِ بقا کو خاک کے مولوں نہ لے
جو دلِ آزردہ اپنی زندگی سے سیر ہے
تا نہ ہو تجھ سا رگِ قاتل سے اپنے آشنا
نقش قدرت کی پیارے لائق تشہیر ہے

CALCUTTA UNIVERSITY CENTRAL LIBRARY

(۲)

دمِ تیغ کا میں ہوں تشنہ لب مجھے مرگ سے سروکار ہے
اسے آبِ خضر نصیب ہو جسے زندگی پہ مدار ہے
تری جلوہ گاہِ ظہور میں کہاں حوصلہ جو رکھوں قدم
نہ تو جی میں بوئے شکست ہے نہ تو دل میں رنگِ فرار ہے
نہ ثبات رنگِ بہار کو ، نہ قیام بوئے نسیم میں
ہو نگاہِ بامزا آشنا کہ خزاں ہی فصلِ بہار ہے
دلِ سوختہ میں جگر کہاں کہ سماوے یاں ہوسِ جہاں
نہ یہ شمعِ بزمِ سرور ہے نہ چراغِ لوحِ مزار ہے
کفِ برق پر ہے مری عناں نہ رہوں کبھی جہہِ آسماں
نہ دے قدرت اب تو فریب یاں کہ جہاں مقامِ قرار ہے

قدرت اللہ قدرتؔ

(وفات: ۱۲۵۰ھ)

(۱)

ہماری خاک پر بلبل یہ کہتی بے قرار آئی
ارے کس نیند سوتا ہے دیوانے اُٹھ بہار آئی
خوشا حالِ سبک روی کہ مدفن تک مرے یارو
صبا دامن میں اپنے لے مرا مشتِ غبار آئی
نہیں حسرت رہی منصور کے ذوقِ شہادت کی
کہ پہنچا سر بلند اب سامنے جب اس کے دار آئی
بچایا ننگ سے منّت کشی کے ذوقِ عصیاں نے
اگرچہ مغفرت سر پر ہمارے بار بار آئی
اگر آرام چاہے ہے تو کر ترکِ ہوس قدرتؔ
نہ کر اندیشۂ اسکندری مت ڈھونڈ دار آئی

(۴)

ہم مست ہو بھی دیکھا آخر مزا نہیں ہے
ہشیاری کے برابر کوئی نشہ نہیں ہے
شوق وصال ہی میں جی کھپ گیا ہمارا
یا آں کہ ایک دم وہ ہم سے جدا نہیں ہے
ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوائے میرا کچھ مدعا نہیں ہے
زیرِ فلک رکا ہے اب جی بہت ہمارا
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے
آنکھیں ہماری دیکھیں لوگوں نے اشک افشاں
اب چاہ کا کسو کی پردہ رہا نہیں ہے
کریے جو ابتدا تو تا حشر حال کہیے
عاشق کی گفتگو کو کچھ انتہا نہیں ہے
میں روؤں تم سنو ہو کیا جانو میرؔ صاحب
دل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے

(۳)

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا　　رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
طائر رنگ حنا کی سی طرح　　دل نہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منھ کر دل کی اور　　اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
میرؔ کس کو اب دماغ گفتگو
عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

(۲)

گرمی سے میں تو آتشِ غم کی پگھل گیا
راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمی عشق مانعِ نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میرؔ
مجنوں کے دشتِ خار کا داماں بھی جل گیا

میر تقی میرؔ

(۱۷۲۲ء - ۱۸۱۰ء)

(۱)

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اُٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے

نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا
شور اک آسماں سے اُٹھتا ہے

سدھ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز
دود کچھ آشیاں سے اُٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے

یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

(۴)

منصور مئے عشق میں سرشار ہوا ہے
اس واسطے مینا اُسے جیوں دار ہوا ہے
زخمی کوں ترے تیر کے مرہم کا اثر نئیں
سینے کی سپر چیر کے وو پار ہوا ہے
وو سروِ ادا جب سیں کیا سیر چمن کوں
قمری کے گلے طوقِ جنوں ہار ہوا ہے
دیکھے سیں ترے زلف کی زنجیر مرا دل
ہر تار کے سودے میں گرفتار ہوا ہے
ہے بس کہ تری چشم کا مشتاق سراجؔ آج
نرگس کے تماشے ستی بیزار ہوا ہے

(۳)

عشق میں اوّل فنا درکار ہے　　دل سیں ترکِ ماسوا درکار ہے
ترکِ مقصد عین مقصد ہے اسے　　جس کوں دل کا مدعا درکار ہے
دل بتنگ آیا ہے اب لازم ہے آہ　　غنچۂ گل کوں صبا درکار ہے
زخمیِ غم کیوں نہ کھینچے آہِ درد　　حلقِ بسمل کوں صدا درکار ہے
وصفِ زلفِ یار کا آساں نہیں　　رشتۂ فکرِ رسا درکار ہے
ہے لبِ ساقی میں چشمہ خضر کا　　گر تجھے آبِ بقا درکار ہے
رنگ میرا کانِ زر ہے اے صنم　　مجھ سے آ مل گر طلا درکار ہے
گوشۂ ابرو دکھا اے قبلہ رو　　ج کوں محرابِ دعا درکار ہے
دل رقیبوں کا جلانے اے سراج
آتشیں رو دل رُبا درکار ہے

G145893

(۲)

شکر اللہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا
شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا
کیا مگر قمری نے تجھ قد کی صفت جا کر کہی
باغ میں شرمندگی سیں سرو خم ہونے لگا
صلح کا پیغام بھیجا اب شمیم ہجر نے
لشکرِ غم بر طرف سب یک قلم ہونے لگا
جب گیا توں سیر کوں بے خود ہوئے اہلِ چمن
سب طرف سیں سجدۂ نقشِ قدم ہونے لگا
شاید اب کے سال ہوئے وصلِ گل بادِ مراد
آہ کے آرے سیں نخلِ دل قلم ہونے لگا
کیوں سراجؔ اوپر نوازش کی نظر کرتے نہیں
دن بدن اب خانہ زادِ بے درم ہونے لگا

سراج اورنگ آبادی

(۱۷۱۵ء - ۱۷۷۷ء)

(۱)

چراغِ مہہ سیں روشن تر ہے حسنِ بے مثال اس کا
کہ چوتھے چرخ پر خورشید ہے عکسِ جمال اس کا
صنم کی زلف کے حلقے میں ہے جیوں جیم کا نقطہ
عجب ہے خوشنما اس عارضِ گلگوں پہ خال اس کا
عیاں ہوتا ہے جیوں کر سرو پانی کے کنارے پر
ہوا یوں جلوہ گر آنکھوں میں قدِ نونہال اس کا
جدا جب سیں ہوا وہ دلبر جادو نظر مجھ سیں
جدا ہوتا نہیں یک آن خاطر سیں خیال اس کا
مجھے ہے آرزو دل میں تری چاہِ زنخداں کی
نہیں درکار حوضِ کوثر و آبِ زلال اس کا
گرفتارِ ہوس کیا لذتِ دیدار کوں پاوے
جدا جو کوئی ہوا ہے آپ سیں پایا وصال اس کا
سراج اے شعلہ رو ہے کون سا سو میں نہیں واقف
مجھے کیا پوچھتا ہے، پوچھ پروانے سیں حال اس کا

(۴)

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے
کیوں نہ ہو مظہرِ تجلّیِ یار
کہ دلِ صاف مثلِ درپن ہے
عشق بازاں ہیں تجھ گلی میں مقیم
بلبلاں کا مقام گلشن ہے
سفرِ عشق کیوں نہ ہو مشکل
غمزۂ چشمِ یار رہزن ہے
ہار مت دے رقیب کوں اے یار
دوستاں کا رقیب دشمن ہے
مجھ کو روشن دلاں نے دی ہے خبر
کہ سخن کا چراغ روشن ہے
اے ولیؔ تیغِ غم سوں خوف نہیں
خاکساری بدن پہ جوشن ہے

(۳)

تجھ مکھ کا یو تِل دیکھ کر لالے کا دل کالا ہوا
تجھ دور خط سوں طوق جیوں مہتاب پر ہالا ہوا
مستی مئیں محشر تلک کونین کوں بسرا ہے دو
جو تجھ نین کے جام سوں مدھ پی کے متوالا ہوا
گلزار کے مبحث مئیں تھی راستی کی گفتگو
شمشاد پر تجھ سرو کا اکثر سخن بالا ہوا
کاجل نین کا دیکھ کر بولے ہیں یوں جادوگراں
عشاق کی تسخیر کوں یو سحر بنگالا ہوا
غمزاں کی فوجاں باندھ کر آئے ہیں راوت نین کے
ہر مُو پلک کا ہاتھ میں ان کے سو، جوں بھالا ہوا
جلتا ہے دوزخ رات دن تیرے جلے کے رشک سوں
مشتاق تیرے درس کا جنت سوں نروالا ہوا
سٹ نین کی شمشیر کی اوجھڑ ولی کے دل اُپر
تیرے شکارستاں میں یو نخچیر ہے پالا ہوا

(۲)

جلوہ گر جب سوں وہ جمال ہوا نورِ خورشید پائمال ہوا
فیضِ تشبیہ قدِ دلبر سوں سر و گلشن منیں نہال ہوا
نشۂ سبزیٔ خطِ خوباں والیٔ عالمِ خیال ہوا
یاد کر تجھ بھواں کی بیت بلند ماہِ نو صاحبِ کمال ہوا
دیکھ کر تجھ نگاہ کی شوخی ہوشِ عاشق رمِ غزال ہوا
حسن اس دل ربا کا مدت سوں عکسِ آئینۂ خیال ہوا
وصف میں تجھ بھواں کے ہر مصرعہ ثانیٔ مصرعۂ ہلال ہوا
جس نے دیکھا ہے تجھ نگہ کی تیغ پھر کے جینا اُسے محال ہوا
عزلِ مجنوں کے بعد مجھ کو ولیؔ
صوبۂ عاشقی بحال ہوا

ولی دکنی

(۱۶۶۸ء - ۱۷۰۷ء)

(۱)

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
عاقبت کیا ہووے گا معلوم نہیں دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر حرف حرف اس مخزنِ اسرار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی بند مت ہو سبحہ و زُنّار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہو نا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

دستیابی کی وجہ سے پریشانیاں پیش آرہی تھیں۔ انہیں بھی مختلف لائبریریوں سے حاصل کر کے منتخباتِ اردو میں شامل کیا گیا۔

زیرِ نظر انتخاب دو حصوں پر مشتمل ہے — پہلے حصے میں منظومات ہیں جبکہ دوسرے حصے میں نثری فن پارے ہوں گے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں شعبہ کے اساتذہ نے بھرپور تعاون کیا ہے، اس کے لئے ان کا بے حد شکریہ۔

اس ضمن میں، میں کلکتہ یونیورسٹی کے عزت مآب وائس- چانسلر پروفیسر سُورنجن داس کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی، جن کی منظوری اور تعاون کے بغیر اس کتاب کا منصۂ شہود پر آنا تقریباً ناممکن تھا۔

شہناز نبی
صدر، شعبۂ اُردو
کلکتہ یونیورسٹی

۲۵/دسمبر، ۲۰۰۹ء

☆☆☆☆

پیش لفظ

ایم-اے اردو (دوسالہ کورس) کے نصاب میں پچھلی بار ۱۹۹۱ء میں ترمیم کی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک اردو ادب کا ذخیرہ نہ صرف وسیع تر ہوا ہے بلکہ اس کے معیار میں بھی خاطر خواہ تبدیلی آئی ہے۔ ایم-اے کورس کو جب سمسٹر (Semester) نظام کے تحت لانے کی بات چلی تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ سمسٹر نظام قائم کرنے کے ساتھ ساتھ نصاب کو بھی مناسب ردّ و بدل سے گذارا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایم-اے اردو کے نصاب کو نئے سرے سے ترتیب دیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ پرانے نصاب کو یکسر باطل قرار دیا جائے۔ لہٰذا ایک طرف پچھلے نصاب میں شامل اردو کے تمام اہم قلم کاروں کی تخلیقات کو اگر جوں کا توں رکھنے کی سعی کی گئی تو دوسری طرف ان مضامین کو خارج کر دیا گیا جن کے نام تو پچھلے نصاب میں شامل تھے لیکن متن دستیاب نہ تھا۔ علاوہ ازیں اردو ادب کا نیا انتخاب بھی داخل کیا گیا تا کہ جدید اور مابعد جدید مواد سے بھی طلباء کو فیضیاب ہونے کا موقع مل سکے۔ گروپ پیپرز میں ایک نیا گروپ 'ترجمے کی روایت' کے نام سے داخل کیا گیا ہے تا کہ اردو اور دیگر زبانوں کے تراجم کے مطالعے کے مواقع بھی ہاتھ آسکیں اور عملی ترجمہ سے بھی واقفیت ہو سکے۔

طلباء و طالبات کی ضرورتوں کے مدنظر کورس میں شامل متون کی اشاعت کو ضروری تصور کرتے ہوئے 'منتخباتِ اردو' کو ترتیب دینے کا کام شروع کیا گیا۔ اردو کے کلاسیکی ادب کی عدم

(۲) جب آنے والے آئیں گے 370-371

- **ندا فاضلی**

(۱) جیون شور بھرا سناٹا 372-373

(۲) بھاگ رہی ہیں کالی راتیں 374-375

سانیٹ

- **اختر شیرانی**

تاثراتِ نغمہ 376-377

- **ن-م-راشد**

انسان ، خواب کی بستی 378-381

☆☆☆☆

- **عبدالغفور شہباز**

(۱) کیوں ہم بشری جمال پیدا کرتے 364

(۲) اخلاق کے عنصر ہوں اگر اصل مزاج

(۳) لوگوں کے خیالات میں ہے کیوں یہ جمود

- **جوش ملیح آبادی**

(۱) دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے 365

(۲) انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار

(۳) اب خواہش لذت نہیں ہوسکتی

(۴) کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری

(۵) مرضی ہو تو سولی پہ چڑھا دینا

- **فراق گورکھپوری**

(۱) نہلا کے چھلکے چھلکے نرمل جل سے 366

(۲) کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری

(۳) اے معنیٔ کائنات مجھ میں آجا

- **آصف بنارسی**

(۱) اُمید پہ ہی زیست کا ہے دارومدار 367

(۲) خود مشکلیں اپنے لئے پیدا نہ کرے

گیت

- **میراجی**

(۱) اَن جانے نگر من مانے تھے 368-369

مثنویات

- **ملّا وجہی**

مدح ابراہیم قطب شاہ گوید ، در شرح شعر گوید 342-347

- **میر تقی میر**

شعلۂ عشق ، در ہجو خانہ خود 348-352

- **پنڈت دیا شنکر نسیم**

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں 353-355

قصائد

- **مرزا محمد رفیع سودا**

قصیدہ باب الجنت در منقبت امیر المومنین 356-358

- **شیخ محمد ابراہیم ذوق**

قصیدہ در مدح ابوظفر بہادر شاہ 359-361

رباعیات

- **میر ببر علی انیس**

(۱) آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا 362

(۲) گلشن میں پھروں یا سیرِ صحرا دیکھوں

- **عبدالغفور خاں نساخ**

(۱) عبرت کا مقام ہے یہ دہر فانی 363

(۲) کیا کام ہے اس سے کہ بہار آجائے

(۳) جس راہ پہ چلتے ہیں یہ اہلِ تقلید

- **حرمت الاکرام**

حسین 297-299

- **بلراج کومل**

ہوا پرستک ، بیذرد بچے 300-301

- **عمیق حنفی**

آئینہ خانے کے قیدی سے ، تخلیہ 302-305

- **کمار پاشی**

یہ گرتا ہوا شہر میرا نہیں ، میرا جرم 306-309

- **شہریار**

نیا کھیل 310

- **عادل منصوری**

وقت کی پیٹھ پر ، والد کے انتقال پر 311-314

- **ندا فاضلی**

لفظوں کا پل 315

- **جینت پرمار**

منو 316-317

مراثی

- **میر ببر علی انیس**

فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے 318-337

- **مرزا سلامت علی دبیر**

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی 338-341

- **ن-م-راشد**

نمرود کی خدائی ، خودکشی ، دریچے کے قریب ، رقص 235-243

- **پرویز شاہدی**

بے چہرگی 244-246

- **فیض احمد فیض**

انتباہ ، نثار میں تیری گلیوں کے... ، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں 247-259

تم اپنی کرنی کر گزرو ، آج بازار میں پابجولاں چلو

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

- **میراجی**

سمندر کا بلاوا ، چل چلاؤ 260-263

- **سردار جعفری**

میرا سفر 264-267

- **مجید امجد**

توسیع شہر ، راتوں کو 268-270

- **اختر الایمان** 271-285

نہ مرنے والا آدمی ، ایک لڑکا ، یادیں ، مسجد ، آخری ملاقات

- **منیب الرحمان**

بازدید 286-287

- **محمد علوی** 288-294

کتبہ ، خالی مکاں ، آخری دن کی تلاش ، آج بھی ایسا ہی ہوگا

- **خلیل الرحمان اعظمی**

میں گوتم نہیں ہوں 295-296

نظمیں

- **قلی قطب شاہ**

فتنۂ دکھن ، شاعر اور حیدر نگر 160-161

- **نظیر اکبر آبادی**

کوڑی ، آدمی نامہ 162-167

- **الطاف حسین حالی**

مناجاتِ بیوہ ، کلمۃ الحق 168-175

- **اکبر الٰہ آبادی**

دربار ۱۹۱۱ء 176

- **علامہ اقبال** 177-218

گلِ رنگیں ، شکوہ ، خضرِ راہ ، بلادِ اسلامیہ ، لینن (خدا کے حضور میں)
ذوق و شوق ، جبریل و ابلیس ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ، شعاعِ اُمید
مسجدِ قرطبہ

- **چکبست**

قومی مسدس 219-223

- **جوش ملیح آبادی** 224-229

دیدنی ہے آج ، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے ، شکستِ زنداں کا خواب

- **اختر شیرانی**

گلبانگِ قفس 230

- **مخدوم محی الدین**

سب کا خواب ، قید 231-234

- عبدالغفور خاں نساخ 63
- قاضی محمد صادق خاں اختر 67
- شاد عظیم آبادی 69
- علامہ اقبال 73
- حسرت موہانی 84
- وحشت کلکتوی 88
- یگانہ چنگیزی 92
- فراق گورکھپوری 96
- جمیل مظہری 100
- پرویز شاہدی 104
- فیض احمد فیض 108
- شکیب جلالی 112
- جاں نثار اختر 116
- ناصر کاظمی 120
- ادا جعفری 124
- سلیم احمد 128
- منچندا بانی 132
- شہریار 136
- ندا فاضلی 140
- عرفان صدیقی 144
- زیب غوری 148
- ظفر اقبال 152
- احمد مشتاق 156

فہرست

- پیش لفظ — شہناز نبی — 13

غزلیں

- ولی دکنی — 15
- سراج اورنگ آبادی — 19
- میر تقی میر — 23
- قدرت اللہ قدرت — 27
- مخلص مرشد آبادی — 31
- غلام ہمدانی مصحفی — 35
- انشاء اللہ خاں انشا — 39
- مرزا جان طپش — 43
- خواجہ حیدر علی آتش — 47
- مرزا اسد اللہ خاں غالب — 51
- مومن خاں مومن — 55
- داغ دہلوی — 59

منتخبات اردو (پہلی جلد، حصہ نظم)

مؤلفہ : ڈاکٹر شہناز نبی
صدر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی
۸۷/۱، کالج اسٹریٹ، کولکاتا-۷۰۰۰۷۳

سال اشاعت : ۲۰۰۹ء
ضخامت : ۳۸۴ صفحات
کمپوزنگ : تسلیم، موبائل:9339116285
قیمت : ۱۰۰/روپے
ملنے کا پتہ : کلکتہ یونیورسٹی سیلز کاؤنٹر، ۸۷/۱، کالج اسٹریٹ، کولکاتا-۷۳

MUNTAKHABAT-E-URDU
(Vol.- I, Verse)

***Compiled* By: Prof. (Dr.) Shahnaz Nabi**
Head, Deptt. of Urdu, University of Calcutta

Published by
UNIVERSITY OF CALCUTTA

G 148893

Published by the Registrar, University of Calcutta,
87/1, College Street, Kolkata - 700 073.
and
Printed by Sri Pradip Kumar Ghosh,
Superintendent, Calcutta University Press,
48, Hazra Road, Kolkata - 700 019

Price : Rs. 100.00

منتخباتِ اردو

پہلی جلد

حصّۂ نظم

ایم-اے (اردو) کورس کے مطابق
۲۰۰۹ء سے نافذ العمل

مؤلفہ
شہناز نبی
صدر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی

CALCUTTA UNIVERSITY
CENTRAL LIBRARY

کلکتہ یونیورسٹی
۱/۸۷، کالج اسٹریٹ، کولکاتا-۷۰۰۰۷۳

منتخباتِ اردو

پہلی جلد

حصّۂ نظم

منتخباتِ اردو

پہلی جلد

حصّۂ نظم

ایم-اے (اردو) کورس کے مطابق
۲۰۰۹ء سے نافذ العمل

مؤلفہ
شہناز نبی
صدر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی

کلکتہ یونیورسٹی
۱۸۷، کالج اسٹریٹ، کولکاتا - ۷۰۰۰۷۳